# رزقِ کریم

## قرآنِ حکیم کی روشنی میں


تحریر و تحقیق:

محمد حنیف

## اعتراف

فہم قرآن کے حوالے سے یہ انسانی کوشش ہے۔ جو سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی۔ تفکر و تدبر دین کے ضمن میں اگر میرا نقطہ نظر درست ہے، تو یہ اس رب کریم کی بے پایاں نوازشات و عنایات کی وجہ سے ہے۔ اگر کہیں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوئی ہے، تو یہ میرا انسانی سہو ہے۔ جسکے لیے میں اپنے رب کے حضور رحمت و مغفرت کا طالب ہوں۔ وہ یقیناً انسان کی نیتوں سے واقف ہے۔

# فہرست مضامین

# پیش لفظ

عمر رواں کی سیڑھی کے چوون ویں پائیدان پر کھڑا آج جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو میرے دل کے اندر موجود درد والم کی وہ کیفیت جو نصف صدی سے میرے ساتھ سفر کر رہی ہے مزید دوچند ہو چکی ہے۔ امت مسلمہ کی حالت زار، ذلت ومسکنت، یہ بے بسی وبے کسی، میرے وجود کو کینسر کی طرح چاٹ رہی ہے۔

یہ قدم قدم پر مصیبتیں، یہ رنج وغم، یہ مشکلیں
میں وفور یاس سے کہہ نہ دوں، کہ خدا ابھی میرا خدا نہیں

دنیا کی یہ عظیم الشان واحد امت جس کے پاس اس کے رب کی آخری اور مستند ہدایت تیس پاروں اور 114 سورتوں کی شکل میں موجود ہو۔ جس میں کوئی کجی نہ ہو، کوئی پیچ وخم نہ ہو، جو مکمل ہو، مفصل ہو، سراپا نور وہدایت ہو اور اس کا یہ حال کہ اب تو مجھے خود ہی اس امت پر رحم آتا ہے اور اس بات پر شرمندگی کہ میں اس دور کی اس امت کا ایک فرد ہوں۔ کاش کہ وہ رب کائنات اس حقیر انسان کو صدیوں پہلے پیدا کر دیتا کہ اپنے نبی ﷺ کے پیروں کے نشانات پر چلتا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

" ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" (89:28)

اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ (ترجمہ: فتح محمد جالندہری صاحب)

کے منصب جلیلہ پر سرفراز ہو چکا ہوتا۔ یا ہزاروں سال بعد پیدا کر دیتا کہ جب یہ امت اس رب کے عطا کئے ہوئے اس پیغام عظیم قرآن کریم کو اس کے حقیقی معنوں میں سمجھ کر کامیابی وکامرانی کی وہ منازل طے کر چکی ہوتی جسے ہم جنت کہتے ہیں۔

23جولائی 1957ء کو سندھ کے ایک گاوں نما شہر لاڑکانہ میں پیدا ہوا۔ کم عمری میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ نقل مکانی کر کے سکھر پہنچ گیا۔ ماں ایک گھریلو سادہ لوح خاتون اور میں گھر میں مردوں میں سب سے بڑا۔ یہ 1969ء کی بات ہے۔ گھر کی روٹی، اپنی اور اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم، اپنوں کی بے رخی، غیروں کے ستم اور بہت سارے حوادث زمانہ۔

ایک دن خدا کی تلاش میں ایک مسجد کے پیش امام کے پاس جا پہنچا۔ پھر مدارس اور ان کے علمائے دین، امام بار گاہیں اور ان کے مذہبی پیشوا۔ مفتیان دین۔ عالم فاضل ۔۔۔۔۔ تب ایک حقیقت کا ادراک ہوا کہ جس خدا کو میں ڈھونڈنے نکلا ہوں وہ اگر سُنیوں کے پاس ہے تو شیعوں کے پاس نہیں۔ وہ اگر اہل حدیثوں کے پاس ہے تو اہل فقہ کے پاس نہیں۔ وہ اگر دیوبندیوں کے پاس ہے تو بریلویوں کے پاس نہیں۔ وہ اگر حنفیوں کے پاس ہے تو شافعیوں اور حنبلیوں کے پاس نہیں۔

یہیں معلوم ہوا کہ یہ جو قرآن ہے یہ ہی واحد دین نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ کسی نے کہا کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے کتب روایات لازم ہیں۔ کسی نے کہا نہیں اس کتاب کے کچھ ظاہری معنی و مفہوم ہیں تو کچھ باطنی مفہوم بھی ہیں اور وہ باطنی مفہوم ہی اصل مفہوم ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں، اب یہ کن کے پاس ہیں انہیں تلاش کرو۔

کسی نے کہا اس کی سات پرتیں ہیں، پھر ان سات پرتوں کے سات بطون ہیں اور ان سات بطون کی سات مزید گرہیں ہیں۔ اس لیے اس کتاب کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہیں آکر معلوم ہوا کہ ہر فرقہ کے بزرگوں نے اپنی اپنی فہم اور عقائد کے مطابق قرآن کریم کے تراجم کئے ہیں اور ہر فرقہ کے پیروکاروں کے لیے ان ہی کے بزرگان کے تراجم قابل قبول ہیں۔ یہیں آکر معلوم ہوا کہ عمومی طور پر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے نزدیک گمراہ ہے، دین سے خارج ہے۔

یہ 1972ء کی بات ہے۔ مسجد و مدارس کے ان تجربات کے دوران دور کہیں ایک آواز سنائی دی۔۔۔۔۔۔۔

"مذہب ایک افیون ہے" سب جھوٹ ہے، فراڈ ہے، کاروبار ہے اور ایسا لگا کہ ہاں یہ ہی ٹھیک ہے۔

شیعہ ملا، سنی ملا، اہل حدیث ملا، شافعی ملا، مالکی ملا، حنفی ملا، حنبلی ملا، سب ملا۔ نہیں ملا تو وہ خدا نہیں ملا جس کی مجھے تلاش تھی اور جو شئے نہ مل سکے وہ ہوتی ہی کب ہے؟

سو ہم سرخے ہو گئے۔ اس دور کے بڑے بڑے نام معراج محمد خان، شیخ رشید احمد مرحوم (پی پی پی والے)، ڈاکٹر مبشر حسن اللہ انہیں صحت دے میرے محسنین میں شامل ہیں۔ آج بھی رابطہ میں ہیں۔ لیکن

آجاؤ گے حالات کی زد پر جو کسی دن

ہو جائے گا معلوم، خدا ہے کہ نہیں ہے

اور وہ خدا دقتاً فوقتاً اپنے جلوے دکھاتا رہا۔ اندر کا انسان اس کائنات کو دیکھ کر یہ ہی سوچتا رہا کہ کیا یہ سب کچھ ایسے ہی وجود میں آ گئے؟ ایک کمی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایک آگ تھی جو بجھنے ہی نہیں پا رہی تھی۔ اور پھر ایک دن وہ جو قرآن نے کہا ہے نا کہ

"وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ"(93:7)

اور رستے سے ناواقف دیکھا تو رستہ دکھایا۔ (ترجمہ: فتح محمد جالندہری)

ایک دن ٹرین میں لاہور کی طرف سفر کے دوران ایک انسان ملا، ابرار احمد صاحب، اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے۔ انہوں نے میری اذیت کو سمجھا اور کہا جہاں جا رہے ہو وہاں ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کا نام "پرویز" ہے۔ یہ 1980ء کی بات ہے۔ ابرار صاحب سے دو دن بعد کا وقت طے ہوا اور دو دن کے بعد میں ابرار صاحب کے ساتھ اس انسان کے ساتھ بیٹھا الجھ رہا تھا جس پر 1000 کفر کے فتوے لگا دئے گئے تھے۔

یہاں سوالات تھے، بیان میں سختی تھی، جملوں میں طنز تھا، ایگریشن تھی اور دوسری طرف، تحمل، برداشت اور شفقت تھی۔ ہر سوال کا مدلل جواب تھا، راہنمائی تھی، پیار تھا۔ کیونکہ میں صرف 23 سال کا ایک پرجوش نوجوان تھا اور وہ میرے باپ کی عمر کے انسان تھے۔۔

اس انسان جس کا نام "غلام احمد پرویز" تھا۔ اس نے اس نشست کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے مجھے کہا، "حنیف صاحب، آپ پہلے میری کتابوں کا تنقیدی مطالعہ کریں، اس پر غور کریں۔ اگر آپ کو لگے کہ میرا نقطہ نظر درست ہے تو ٹھیک۔ لیکن اگر آپ سمجھیں کہ نہیں میرا نقطہ نظر درست نہیں تو مجھ سے صرف ایک وعدہ کریں۔ اس کتاب

کو جس کا نام قرآن ہے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ جو کچھ بھی ہے اس میں ہے، آپ کے درد کا درماں یہ ہی کتاب ہے، آپ کے سوالوں کا جواب بھی اس ہی میں ہے۔

باقی جو کچھ بھی ہے وہ انسانی کوششیں ہیں بالکل میری طرح۔ انسان کی کوئی بات حتمی نہیں ہوتی، سند نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ انسان کی سوچ اور سمجھ میں فرق آتا رہتا ہے، ممکن ہے میری کوئی بات آپ کو آج غلط لگے لیکن کچھ عرصہ کے بعد آپ اس سے متفق ہو جائیں اور ممکن ہے میری کوئی بات آج آپ کو درست لگے لیکن کچھ عرصہ کے بعد آپ اس کو غلط ثابت کر دیں۔ اور، ممکن ہے کہ میں خود اپنے کسی نظریہ یا فہم قرآن کے کسی حصے سے آنے والے کسی وقت میں رجوع کر لوں کیونکہ میں انسان ہوں مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے۔

اس عظیم انسان سے شرف ملاقات کے بعد جوں جوں میں ان کی تصانیف پڑھتا گیا میرے اندر کا انسان پر سکون و مطمئن ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میں 1982ء میں کچھ عرصہ کے لیے لاہور منتقل ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب میری نظر میں جو پرویز نے کہا وہ ہی صحیح تھا۔ پابندی کے ساتھ دروس میں شرکت، جتنا لٹریچر دستیاب تھا سب کا مطالعہ اور اس انسان سے مزید دو ذاتی ملاقاتیں محترم ابرار صاحب مرحوم کے ساتھ۔

جو سوال کیا اس کا مدلل جواب ملا سوائے دو سوالات کے۔ ایک بار میں نے پوچھا۔ بابا جی، آپ کہتے ہیں اللہ اپنی سنت نہیں بدلتا تو کیا انسانوں سے بات کرنا خدا کی سنت ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا یہ سارے انبیاءعلیہ السلام انسان نہ تھے اور ان انبیاءعلیہ سلام سے براہ راست بات، کیا سنت اللہ میں اپنی منشاء کے ساتھ تبدیلی نہیں؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ نزول قرآن کے وقت یہ عقیدہ عام تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ مریم صادقہ بن بیاہے ان کی ماں بن گئی ہیں۔ ایسے عقیدے کی موجودگی میں آخر کیوں پورے قرآن میں اس واحد نبی کو اپنی ماں کے نام سے پکارا گیا؟

قرآن کریم میں بار بار "عیسیٰ ابن مریم" کے الفاظ اس عقیدہ کو مضبوط کرتے ہیں یا رد کرتے ہیں؟

میرے ان سوالات کے جواب میں پرویز علیہ رحمہ نے خاموشی اختیار کی اور میں تشنہ و ناکام واپس لوٹ آیا۔ اور پھر 1985 میں ہم اس عظیم انسان سے محروم ہو گئے۔

یہ ہی دو سوالات میں آج بھی ہر اس انسان سے کرتا ہوں جس سے مجھے توقع ہوتی ہے لیکن مجھے اس کا شافی جواب نہیں ملتا۔ اس کے بعد عربی سیکھی۔ قرآن کریم کو اپنی فہم سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اپنے اسلاف کے اس لٹریچر کو پڑھا جسے کچھ لوگ، عجمی سازش، یہودی ایجنٹ اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر پکارتے ہیں۔

تاریخ اسلام سے آگہی حاصل کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ چودہ سو سالوں سے ہر دور کے مسلمان دین کو سمجھنے کی جستجو اور کوششوں میں لگے رہے۔ ان میں کوئی بھی سازشی نہ تھا بلکہ ہر دور کے انسان کی اپنی فہم و فراست تھی۔ جس نے جتنا سمجھا ہم تک منتقل کیا۔ ہمارے اسلاف، ہمارے مفسرین، ہمارے محدثین، ہمارے علماء، ہمارے دانشور سب کے سب انسان تھے۔ وہ دین سے مخلص تھے، اللہ کی بات لوگوں تک پہنچانے کے متمنی تھے۔ سب نے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق دین کی ترویج کی کوشش کی۔

خواہ بخاری علیہ رحمہ اور ان کے رفقائے محترم تھے خواہ پرویزؒ و دیگر اکابرین کرام۔ ان بڑوں نے کسی بھی جگہ خود کو دین کا ٹھیکیدار قرار نہیں دیا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی فکر کو دین میں حجت قرار نہیں دیا۔ ان میں سے کسی نے عقل کل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان سب بڑوں نے اپنی کم علمی، کوتاہی اور انسانی کمزوریوں کا برملا اعتراف کیا۔ اس پر اپنے رب سے معافی کی طلب کرتے رہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک بدقسمتی جو مسلسل امت مسلمہ کا پیچھا کرتی چلی آ رہی ہے اور کہیں بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی وہ ان بڑوں کے بعد کے لوگوں میں شخصیت پرستی کا جذبہ ہے۔ ان بڑوں کے جانے کے بعد ہمارے لوگوں نے ان بڑوں کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیا۔ چاہت اور عقیدت کے جذبات سے مغلوب ہمارے لوگ اپنے ان بڑوں کو انسانی سہو و خطا سے منزہ قرار دیتے رہے۔ ان کے لکھے ہوئے ہر لفظ کو فرمان ربی اور دین میں حجت قرار دیتے رہے اور اس فکر کی وجہ سے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے۔ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے۔

ایک طرف دوستوں نے بخاری و مسلم علیہ رحمہ سے اختلاف کو کفر قرار دے دیا، کسی نے تھانوی، بریلوی اور اہل حدیث بزرگانؒ کے خیالات کو دین سے بغاوت قرار دیا۔ کسی نے پرویزؒ کو کافر قرار دے دیا تو دوسری طرف پرویزؒ کو ماننے کے مبینہ دعوے داروں نے بخاریؒ، مسلمؒ اور امت کے دیگر محترم اکابرین کو یہودی ایجنٹ، دین کے غدار

اور عجمی سازش کاروں کے نام کے خطابات دینا شروع کر دیئے۔ لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی اس عمل کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ نہ بخاریؒ و مسلمؒ و دیگر اکابرین کرام کے چاہنے والوں کے پاس دوسروں کو گالیاں دینے کی کوئی تعلیم ہے، نہ کسی کو کافر قرار دینے کی ترغیب۔ بالکل اس ہی طرح پرویز علیہ رحمہ کے چاہنے والوں کے پاس کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی جہاں پرویز علیہ رحمہ نے کبھی ان محترم اکابرین کرام کو گالیاں دی ہو، ان کو برا بھلا کہا ہو، ان کی تضحیک کرنے کی ترغیب دی ہو۔ دین کے حوالے سے نظریاتی اختلاف اپنی جگہ لیکن پرویز علیہ رحمہ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی بھی ان بڑوں کو گالی نہیں نکالی، ان کے ناموں کے ساتھ ہمیشہ علیہ رحمہ کے الفاظ استعمال کیے، ان کے لیے حسن ظن کا مظاہرہ کیا۔

آج میرے مخاطب قرآنی فکر کے وہ دوست ہیں جنھوں نے پرویز علیہ رحمہ کو پڑھا ہے، سنا ہے، سمجھا ہے جو پرویز علیہ رحمہ کی فکر سے متفق ہیں، ان کے ہم خیال ہیں۔ ان میں اس خاکسار کا نام بھی شامل ہے۔

میری فہم کے مطابق علامہ پرویز علیہ رحمہ کی زیادہ تر فکر اور تعلیم عین قرآن ہے لیکن اس کے ساتھ ان سے بھی کچھ سہو سرزد ہوئے ہیں۔ قرآن کو سیکھنے کے عمل میں ہر انسان سے سہو ممکن ہیں۔ ہم کیوں پرویز علیہ رحمہ کو خدائی صفات کا حامل سمجھ لیں؟ ہم کیوں ایسا سمجھیں کہ ان سے غلطی نہیں ہو سکتی تھی؟

آج ہمیں اس بات پر تفکر اور تدبر کرنا ہو گا کہ دین میں سند کون ہے؟ کتاب اللہ یا کوئی انسان؟ اس کے بعد ہمیں ان لوگوں کے حوالے سے سوچنا ہو گا کہ جو نام تو پرویز علیہ رحمہ کا لیتے ہیں لیکن اس بڑے انسان کے نام پر ایسے ایسے نظریات پیش کرتے ہیں جو اس انسان کے قریب سے بھی نہیں گذرے۔

میں نے اپنی ان آنکھوں سے علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ کو عام مسلمین کی طرح پانچ وقتہ نماز پڑھتے دیکھا ہے بالکل ویسے ہی جیسا کہ میں پڑھتا ہوں، جیسے عام حنفی لوگ پڑھتے ہیں لیکن کچھ لوگ پرویزؒ کا نام لے کر صلوٰۃ کے اس جز سے انکار کرتے ہیں۔ پرویزؒ نے کبھی بھی بخاری علیہ رحمہ کو گالی نہیں نکالی بلکہ انکے لیے ہمیشہ رحمت خداوندی کی دعا کی ہے لیکن کچھ لوگ ان ہی بخاری علیہ رحمہ کو گالیاں نکالتے ہیں۔ انکے یہودی ایجنٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہیں دین کا سب سے بڑا مجرم قرار دیتے ہیں۔

پرویزعلیہ رحمہ نے کبھی بھی خود پر تنقید کو حرام قرار نہیں دیا۔نہ ہی خود کو دین میں سند قرار دیالیکن کچھ لوگ پرویز علیہ رحمہ کی مخالفت کو قرآن کی مخالفت قرار دیتے ہیں، پرویزؒ کو دین میں سند کا درجہ عطا کرتے ہیں، ان کے پیش کردہ قرآنی فکر اور مفہوم کو ہی حرف آخر سمجھتے ہیں۔پرویزعلیہ رحمہ کے مفہوم القرآن کے علاوہ دیگر اکابرین کے تراجم کو حرف غلط سمجھ کر مسترد کر دیتے ہیں۔

دوستو! سمجھنے کی بات صرف یہ ہے کہ کیا یہ ہی پرویزؒ کی تعلیم تھی یا کچھ لوگ پرویزؒ کے نام کو استعمال کر رہے ہیں؟اس کے نام پر وہ کچھ پیش کر رہے ہیں جو پرویزؒ نے کبھی کہا ہی نہیں؟

وہ شخص ایک تعلیم یافتہ، مدبر، چھوٹے بڑوں کی عزت کرنے والا، ادب و آداب کا پابند، ایٹی کیٹ اور مینرز کا مالک، دوران گفتگو نہ ٹوکنے والا، دوسروں کو بات پوری کرنے کا موقع دینے والا، تحمل سے جواب دینے والا تھا۔۔۔۔۔۔
کبھی کوئی گری ہوئی حرکت اور گھٹیابات کم از کم میرے علم میں نہیں۔

یہاں میں اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔بزم طلوع اسلام کی ایک محفل تھی۔پرویزؒ صاحب اس کی صدارت کر رہے تھے۔ملک کے مختلف حصوں سے دوست و احباب وہاں موجود تھے۔باری باری سب اسٹیج پر آکر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔کچھ دوست اپنی باری پر اسٹیج پر آئے،وہ کہنے لگے۔ہم گمراہ تھے،ہم دین سے دور تھے،اگر ہمیں پرویز صاحب جیسا انسان نہ ملتا تو ہم تو جہنم کا شکار ہو گئے تھے اور آخر میں کہا"سچ تو یہ ہے کہ ہم آج ہی مسلمان ہوئے ہیں۔کل تک تو ہم کفر کی زندگی گذار رہے تھے"۔

اور پھر مجھ سمیت تمام حاضرین نے اس انسان کو جس کی صفات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے جذبات سے تمتماتے ہوئے چہرے کا ساتھ اسٹیج کی جانب لپکتے دیکھا۔تمام تر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر ان دوستوں کے ہاتھ سے مائیک چھینا اور کہا۔ آپ تشریف رکھیں۔پھر انتہائی دکھ کے عالم میں کہا

" یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں موجود نہیں۔جو میرے فکر سے متفق نہیں۔وہ سب کافر ہیں۔وہ مسلمان نہیں ہیں۔میں آپ کو ایسی بات کرنے کی اجازت ہر گز نہیں دے سکتا۔کیا آپ مجھے امت سے کاٹ دینا چاہتے ہیں؟کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنے بھائیوں سے کٹ کر کس طرح ان تک اللہ کا پیغام پہنچا سکتے ہیں؟

بخدا ہم سب مسلمان ہیں۔ کوئی بات اگر ہمارے کسی بھائی کی سمجھ میں آج نہیں آ سکی ہے تو کل آ جائے گی اور عین ممکن ہے کہ کوئی بات جو ہم آج کہہ رہے ہیں آنے والے کل میں اس سے رجوع کر لیں۔ میں ایک انسان ہوں۔ مجھ سے غلطی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ میں دین میں سند نہیں ہوں۔ جو کچھ بھی ہے یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اگر میں کہیں صحیح ہوں تو یہ اس کتاب کا صدقہ ہے اور اگر میں کہیں غلط ہوں تو یہ میری نادانستہ غلطی ہے، میرا ذاتی فعل ہے۔ آپ صرف قرآن پر نظر رکھیں۔ اللہ آپ سے قرآن کا پوچھے گا، پرویز کا نہیں۔"

دوستو! کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم ایسے نظریات، افکار اور خیالات کہ جن کا پرویز علیہ رحمہ سے کوئی تعلق نہ ہو، انہیں پرویزؒ کے نام سے پیش کرنے کی مزاحمت کریں۔ سچ سامنے لائیں۔ پرویز علیہ رحمہ کو ایک انسان سمجھیں۔ ان کے کام کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اگر کہیں کچھ غلط ہو تو اپنے سابقین کی طرح کیا ہم بھی پرویزؒ کو دین میں سند مان کر ان کی غلطیوں کا دفاع کرنا شروع کر دیں؟ ان کی مورتی بنا کر ان کی پرستش کرنا شروع کر دیں؟ تقلید پرستی اختیار کریں اور فکرِ پرویزؒ اور ان کے نظریات سے علمی اختلاف کو قرآن کریم سے اختلاف قرار دینا شروع کر دیں؟
آخر میں پرویز علیہ رحمہ کی تحریر کا وہ عظیم الشان اقتباس پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو وہ اپنی ہر تصنیف کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں۔
"میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآن کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے کہ نہیں۔ اسے اچھی طرح سن رکھیے کہ جس دین آپ نے دین کے معاملے میں قرآن کریم کے بجائے کسی انسان کو سند مان لیا آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رو سے شرک ہے"
میری یہ کتاب میرے مختلف نوٹس پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوانات کتاب کی ابتداء میں دیئے گئے ہیں۔ چونکہ میرے یہ نوٹس اپنی اپنی جگہ ایک مکمل مضمون کے فارمیٹ میں ہیں۔ اس لیے بعض باتیں تکرار کے ساتھ، ان سب نوٹس میں آپ کو نظر آئیں گی۔ ممکن ہے یہ بات آپ کو گراں گزرے۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

اللہ کریم سے دست بہ دعا ہوں کہ ہم سب کے دلوں کو قرآن کریم کی حقیقی تعلیم کو سمجھنے کے لیے کشادہ فرما دے۔ ہماری راہ نمائی اس صراط مستقیم کی جانب فرما دے جس کی دعا ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی تھی۔ آمین

سلامت رہیں

# وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡآن

کائنات کی وسعتوں پر، اس کے نظم وضبط پر، اس میں موجود غیر متبدل قوانین پر جب بھی کسی صاحب شعور انسان نے تدبر و تفکر کیا تو بے ساختہ پکار اٹھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ وہی خدا ہے۔

میرے اس مضمون کا مخاطب صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ رب العزت کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں۔ جو اس بات پر غیر مشروط یقین رکھتے ہیں کہ اس کتاب میں موجود ایک ایک لفظ من جانب اللہ ہے، اٹل ہے، غیر متبدل ہے۔ میرے اس مضمون کو لکھنے کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب عظیم کو اپنی فہم سے سمجھنا چاہتے ہیں انہیں وہ ابتدائی راہنمائی حاصل ہو جائے جو اسے اس کتاب عظیم کو سمجھنے کے قابل بنا دے کیونکہ ہر شعبہ زندگی کی طرح دین کے ضمن میں بھی بہت سارے ایسے خود ساختہ عالم اور مذہب کے ٹھیکیدار وجود میں آ چکے ہیں جو بڑی شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ کتاب بہت مشکل کتاب ہے ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی، اس میں بڑے پیچ و خم ہیں، یہ ایک مبہم کتاب ہے، نامکمل کتاب ہے، اس میں بہت سارے تضادات ہیں اور اسے سمجھنے کے لیے کسی مخصوص علامہ، مفتی، مولانا کی ضرورت ہے۔ کوئی مولانا صاحب یہ کہتے ہیں کہ جناب اس قرآن کی سینکڑوں پرتیں ہیں۔ کوئی علم لدنی کی باتیں کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ قرآن کریم کے مخفی معنی بھی ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کسی نے کہا کہ یہ قرآن صرف اور صرف کتب روایات کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح عام آدمی ہدایت ربی کی جستجو میں اس طرح بھٹکتا چلا جا رہا ہے جیسے صحرا میں کوئی راہ گم کردہ۔

ان کے بعد ہمارے وہ محترم اکابرین آئے جنہوں نے قرآن کریم پر بہت محنت کی اللہ کے پیغام کو انسانوں تک پہنچانے کی کوششیں کیں۔ اس کے حقیقی پیغام کو عام کرنے کی جدوجہد کی لیکن بد قسمتی سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر وہ بھی عام انسانوں کو ایک اور مشکل سے دوچار کر گئے۔

قرآنی فکر کے ہمارے ان محترم اکابرین نے سب سے پہلی غلطی تو یہ کی کہ امت میں موجود تمام کے تمام سابقہ علمی لٹریچر کو عجمی سازش کہہ کر مشکوک قرار دے دیا۔ قرآن کریم پر ہونے والے سابقہ تمام کام کو حرف غلط کی طرح مسترد کر دیا۔ اس کے بعد بزعم خود یہ نظریہ دیا کہ قرآن کریم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مفہوم ہی بیان کیا جا سکتا ہے (میں بھی اس نظریہ کا قائل ہوں کہ قرآن کریم کو مفہوم ہی سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن کیا کسی لفظ کو سمجھے بغیر، اس کے معنی کو جانے بغیر اس کا مفہوم کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ چنانچہ ترجمہ پہلی شرط ہے۔ قران کریم کی کسی آیت مبارکہ کا پہلے ترجمہ ہی ہو گا پھر اس آیت مبارکہ کو قرآن کریم کی عمومی تعلیم، اسلوب بیان کے مطابق سمجھا جائے گا)۔

پھر اس مفہوم کے نام پر جس آیت کا جو چاہا معنی بیان کر کے اپنے نظریات کو قرآنی سند عطا کر دی یعنی ان سابقین کی طرح ہمارے ان قرآنی فکر کے بزرگوں نے بھی امت کے عام آدمی کو یہ ہی بتایا کہ تم اس قرآن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے عام معنی نہیں کر سکتے۔ ہر آیت کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس خاص مفہوم کے حصول کے لیے کسی پروفیسر، کسی علامہ کی ضرورت پڑے گی ہی کیونکہ امت کی عمومی اکثریت تو بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی ہی نہیں ہے۔۔۔۔

ہمارے ان بزرگوں نے اپنی فہم سے قرآن کریم کے مفہوم بیان کئے اور سب سے مزیدار بات یہ ہے کہ اپنے مفہوم کی سند کے طور پر ان ہی لوگوں کی لغات کے حوالے دیئے جنہیں دین کے مجرمین کے طور پر سامنے پیش کرتے تھے۔ ان ہی لغات کا سہارا لیا گیا جنہیں عجمی سازش کہہ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ اپنے نظریات کو مفہوم کی شکل میں بیان کرتے ہوئے ہمارے ان بڑوں نے قرآن کریم کے سادہ ترین الفاظ کو بھی فلسفیانہ رنگ میں رنگنے کی غلطی کی اور قرآن کریم کے عام قاری کو اس ہی اذیت میں مبتلا کر دیا جس میں یہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے ان قرآنی فکر کے دانشوروں سے پہلے کے لوگوں نے قرآن کریم کو گنجلگ اور عام آدمی کی سمجھ میں نہ آنے والا ثابت کرنے کے لیے سینہ بہ سینہ علم کا دھوکہ دیا تو کہیں کتب روایات کا محتاج قرار دیا اور ہمارے ان قرآنی فکر کے بزرگوں نے اس ہی قرآن کو اپنی فہم اور اپنے پیش کئے ہوئے مفہوم کا محتاج بنا دیا۔ عام آدمی کل بھی ایک مولوی کے بغیر اس قرآن کو نہ سمجھنے کے عذاب میں مبتلا تھا اور آج کسی علامہ کے بغیر نہ سمجھنے کے عذاب میں مبتلا ہے۔

ہمارے دور میں قرآنی فکر کی جس بڑی شخصیت پر زیادہ بات کی جاتی ہے، جن کی تعلیمات سے لوگوں کی ایک قابل ذکر تعداد متفق ہے وہ علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ ہیں۔ خاکسار پرویز علیہ رحمہ کی فکر سے ایک طویل عرصہ سے واقف ہے۔ ان کی تمام کاوشیں جو کتب اور دروس کی شکل میں دستیاب ہیں ان کو پڑھا، دیکھا اور سمجھا ہے۔ میری نظر میں پرویز علیہ رحمہ ایک بہت بڑی علمی شخصیت تھے۔ قران کریم کے مخلص طالب علم تھے انہوں نے اپنی فہم کے مطابق قرآن کریم کو پیش کیا اور اس اعتراف کے ساتھ پیش کیا کہ ان کا لکھا ہوا کوئی لفظ اور کہا ہوا کوئی جملہ حرف آخر نہیں ہے۔

انہوں نے ہمیشہ اپنے پیش کردہ کام کو ایک انسانی کوشش قرار دیا اور اس میں کسی غلطی اور کوتاہی سے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ ان تمام تر خوبیوں کے باوجود پرویز علیہ رحمہ بہر حال ایک انسان ہی تھے اور کوئی بھی انسان ان انسانی کوتاہیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا جو انسانوں کی سرشت میں شامل ہوتی ہیں۔ پرویز علیہ رحمہ کے اپنے کچھ مخصوص نظریات تھے۔ جس دور سے ان کا تعلق تھا وہ سائنسی طور پر علمی ترقی کا ابتدائی دور تھا، ساتھ ہی سوشلزم کے عروج کا زمانہ تھا چنانچہ ہر انسان کی طرح پرویز علیہ رحمہ کا اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہونا اور اس ماحول کے مخصوص تناظر میں قرآن کریم کو سمجھنے کی کوششیں کرنا کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے۔

ہاں ایک بات اٹل ہے کہ وہ قرآن کریم سے مخلص تھے۔ ان کی فہم کی کسی غلطی کو ہم ان کی بدنیتی ہر گز قرار نہیں دے سکتے۔ ہم ان کے نظریات سے اختلاف کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ان کی پیش کی ہوئی سوچ پر تنقید کر سکتے ہیں۔ ان کے کام پر تبصرہ کر سکتے ہیں اور قرآن کریم کو پیش کرنے کے عمل میں ان سے کوئی انسانی سہو سرزد ہوا ہو تو اس نظریہ

کو قرآنی دلائل کے ساتھ مسترد کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہیں۔ خود علامہ پرویز علیہ رحمہ نے اس ہی کی ترغیب بھی دی تھی۔ آج بھی علامہ پرویز علیہ رحمہ کی ہر تصنیف پر یہ الفاظ خصوصی طور پر لکھے جاتے ہیں کہ

"فکر قرآنی کے لیے پرویز سند نہیں ہے"

یہ ایک مسلسل المیہ ہے کہ ہر بڑے آدمی کے جانے کے بعد امت میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو اس بڑے آدمی کی مورتی بنا لیتے ہیں۔ اسے دین میں سند مان کر ان کے مقلد بن جاتے ہیں اور اس طرح علامہ پرویز علیہ رحمہ کے الفاظ میں شرک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

علامہ پرویز علیہ رحمہ کے کچھ مخصوص نظریات تھے۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کبھی بھی مافوق الفطرت کام نہیں کرتا۔ کوئی بھی ایسا کام جو انسانی سمجھ میں نہ آسکے وہ غلط ہے وغیرہ وغیرہ (میرے ایک سوال کا جواب نہ تو علامہ مرحوم دے سکے اور نہ ہی ان کا کوئی چاہنے والا دے سکا کہ اللہ کا براہ راست انسان سے کلام کیا اپنے آپ میں خود ایک مافوق الفطرت عمل نہیں ہے؟)۔

یہ ہی وجہ تھی کہ قرآن کریم میں جب بھی کوئی ایسی آیت مبارکہ آئی جو پرویز علیہ رحمہ کے مخصوص نظریات سے متصادم تھی، اس کا ایسا مفہوم بیان کیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

عربی زبان کا ایک لفظ ہے "لیل" اس کے معنی رات کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور رات ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور جناب پرویز علیہ رحمہ کے بیان کردہ اپنے فہم قرآن کے اصول "تصریف آیات" (جو قرآن کریم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے اور خود اللہ کریم نے ہمیں اس طریقہ کے مطابق قرآن کریم کو سمجھنے کا حکم دیا ہے) کے مطابق اس لفظ "لیل" کا مفہوم رات ہی بنتا ہے۔ اب چونکہ پرویز علیہ رحمہ کا یہ نظریہ پہلے سے قائم تھا کہ کوئی ایسی مخصوص رات نہیں ہوتی چنانچہ اپنے پیش کردہ تمام اصول وضوابط اور تصریف آیات کے اصول کو پس پشت ڈال کر سورہ قدر میں اس لفظ "لیل" کا ترجمہ "تاریکی"، "ڈارک ایج" کر دیا۔ حالانکہ قرآن کریم میں تاریکی کے لیے مخصوص لفظ "ظلمات" کا استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ (44:23)

(جواب دیا گیا) اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ (36:37)

اِن کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اُس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو اِن پر اندھیرا چھا جاتا ہے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

یوں تو بے شمار آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن مضمون کی طوالت کا خوف اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مذکورہ دونوں آیات مبارکہ اس لفظ" لیل" اور" ظلمات" کے فرق کو صاف ظاہر کر رہی ہیں۔ قرآن کریم اس" لیل"، کہ جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی، اسے ایک مبارک" لیل" قرار دے رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ (44:3)

کہ ہم نے اِسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

غور طلب بات ہے قرآن اس لیل کو مبارک کہہ رہا ہے۔ اب اگر" لیل" کے معنی تاریکی، ڈارک ایج لئے جائیں تو آپ ہی بتائیں کہ یہ" تاریکی اور ڈارک ایج" کس طرح سے "مبارکۃ" کے زمرے میں آسکتے ہیں؟

وہ دور کہ جب دنیا وحی خداوندی سے محروم تھی (اصولاً یہ تصور بھی غلط ہے کہ نزول قرآن کے وقت" انجیل اور توریت" موجود تھیں۔ بے شک کہ ان میں ترامیم ہو چکی تھیں لیکن کیا وہ مکمل طور پر وحی سے محروم تھیں۔ ایسا تو آج بھی نہیں ہے۔ ان کتابوں میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ وحی موجود ضرور ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ پرویز علیہ رحمہ نے اپنے موقف کی سند کے طور پر جابجا موجودہ توریت اور انجیل کے حوالے دیتے ہیں) ہاں تو وہ دور کہ جب پرویز علیہ رحمہ کے مطابق دنیا وحی خداوندی سے محروم تھی وہ دور کس طرح" قابل مبارک" ہو سکتا ہے؟

اس طرح کی اور کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن چونکہ یہاں میرا موضوع کوئی شخصیت نہیں ہے۔ اس لیے اس ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ خواہ وہ چودہ صدیوں کے دوران کے ہمارے اسلاف ہوں یا موجودہ دور کے قرآنی

فکر کے اکابرین سب کا ایک بات پر تو اتفاق ہے ہی کہ " اللہ نے قرآن میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے اسے سمجھنے کے لیے کسی نہ کسی ایکسپرٹ کا ہونا لازم ہے"

کسی مولوی، کسی مفتی، کسی عالم دین یا کسی علامہ کی ضرورت ہے۔ اس ہی طرح ان بزرگان کے پیروکاروں کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ جو کچھ ان کے بزرگ نے کہہ دیا ہے وہ اٹل ہے، وہ ہی دین ہے، وہ ہی منشائے ربی ہے۔ اگر ہمارے دور کا کوئی دوست جناب اشرف تھانویؒ صاحب کو دین میں حرف آخر سمجھتا ہے، اگر کوئی جناب مودودیؒ صاحب کو دین میں حرف آخر سمجھتا ہے، اگر کوئی جناب احمد رضا خانؒ بریلوی صاحب کو دین میں حرف آخر مانتا ہے تو بالکل اس ہی طرح کچھ لوگ جو پرویز علیہ رحمہ کی تعلیم اور افکار سے متاثر ہیں ان ہی کو حرف آخر کا درجہ دے کر ہر اس انسان کو گالیوں سے نوازتے ہیں جو اپنی فہم و تدبر سے دین کے کسی مسئلہ پر پرویز علیہ رحمہ کے نقطہ نظر سے اختلاف کرے۔

بد قسمتی سے ہمارے دور کے یہ احباب جو تھانوی صاحب، بریلوی صاحب، مودودی صاحب یا پرویز صاحب کو دین کے حوالے سے اپنا راہبر مانتے ہیں کبھی اس بات کی تحقیق نہیں کرتے کہ کیا ان میں سے کسی محترم بزرگ نے کبھی اپنے کہے کو یا اپنے لکھے کو حرف آخر قرار دیا ہے؟ کیا جناب مودودی صاحب کی کوئی ایسی تحریر پیش کی جاسکتی ہے جس میں انہوں نے خود کو سند قرار دیا ہو؟ کیا تھانوی صاحب، بریلوی صاحب کے پیروکار ان محترم بڑوں کا کوئی ایسا دعویٰ سامنے لا سکتے ہیں؟ اس ہی طرح کیا پرویز علیہ رحمہ کا کوئی ، پیروکار پرویز علیہ رحمہ کی کوئی ایسی تحریر دکھا سکتا ہے، جس میں انہوں نے خود کو دین میں حجت قرار دے دیا ہو؟ خود کو حرف آخر قرار دے دیا ہو؟ خود پر تنقید کو حرام قرار دیا ہو، کفر قرار دیا ہو؟ ہر گز نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔

ہمارے یہ سارے بڑے ہماری طرح تنگ نظر نہیں تھے۔ یہ سب علم اور تحقیق کے لوگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کوئی بھی انسان حرف آخر نہیں ہوتا۔ دین کے حوالے سے حجت صرف اللہ کی کتاب ہے اور انسانوں میں صرف حضرات انبیائے کرام علیہ السلام۔

یہ کتنی بد قسمتی ہے کہ جس طرح ہمارے روایت پسند دوست بخاری علیہ رحمہ، مسلم علیہ رحمہ اور دیگر اکابرین کی پیش کردہ تعلیمات اور کتب سے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں بالکل اس ہی طرح ہمارے یہ بزعم خود قرآنی فکر کے دعوے دار

دوست، پرویز علیہ رحمہ کے افکار سے انکار کو یا اس پر تنقید کو براہ راست قرآن کی مخالفت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے یہ دوست دانستہ یا غیر دانستہ طور پر پرویز علیہ رحمہ کے پیش کردہ نظریہ ہی کو قرآن سمجھتے ہیں اوراس کے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں۔

دوستو! اللہ کریم نے انسان کو تخلیق کیا۔اسے عقل و شعور کی دولت سے مالا مال کیا۔ اسے ارادے کی قوت اور اپنے مرضی سے اپنی راہ اختیار کرنے کی طاقت عطا فرمائی۔ ایسے میں یہ بات انصاف کے بنیادی اصول کے ہی خلاف چلی جاتی اگر وہ اس انسان کو اس بات کی راہنمائی فراہم نہ کرتا کہ "کون سا راستہ درست ہے جو اسے منزل پر لے جا سکتا ہے۔ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے اور کون سا راستہ غلط ہے جس پر چلنے کا نتیجہ منزل سے دوری ہے، گمراہی ہے، ناکامی و بربادی ہے"۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے، دنیا کے ہر انسان کی راہنمائی کے لیے اپنی کتابیں اپنے انبیائے کرام علیہ السلام کے توسط سے نازل کیں۔ اس سلسلہ رشدوہدایت کی آخری کڑی قرآن کریم ہے۔ اللہ کریم نے اپنے آخری نبی محمد ﷺ کے توسط سے یہ کتاب عظیم ہم تک پہنچائی۔ اسے آج دنیا میں موجود تمام انسانوں اور قیامت تک آنے والے ہر انسان کی راہنمائی کے لیے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری بھی خود پر عائد کرلی اور اب یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ جو قرآن کریم آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے یہ حرف بہ حرف وہی ہے جو نبی آخر ﷺ پر نازل ہوا۔

دوستو! جیسے کے میں نے عرض کی کہ اس کتاب اللہ کو نازل کرنے کا واحد مقصد تمام نوع انسانی کو تا قیامت راہنمائی فراہم کرنا ہے تو پھر یہ سوال ضرور اٹھنا چاہیے کہ کوئی ایسی کتاب جو اتنی مشکل ہو جیسا کے ہمارے نام نہاد علماء کہتے ہیں ، کس طرح کسی عام انسان کو، کوئی راہنمائی فراہم کر سکتی ہے؟

آیئے سب سے پہلے ہم اپنی دنیا میں، انسانوں کے اختیار کردہ طریقہ کار پر غور کرتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں ہم؟ اگر ہمیں کوئی بات اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سمجھانی ہو، اپنے بچوں کو سمجھانی ہو یا اپنے شاگردوں کو سمجھانی ہو کیا کرتے ہیں ہم؟

کیا ہم اپنی بات سمجھانے کے لئے بڑے بڑے ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں؟

کیا ہم اپنی بات گھما پھرا کر کرتے ہیں؟

کیا ہم اپنی بات ادھوری اور نامکمل کرتے ہیں؟

کیا ہم اپنی بات کو اتنی فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں کہ جسے سمجھنے کے لیے ہمارے بچوں، شاگردوں کو ساری عمر لگا دینی پڑے؟

غور فرمائیں کیا کرتے ہیں ہم؟

ہم اپنے سے چھوٹوں کو، اپنے سے کم علم لوگوں کو ان کی ذہنی سطح پر جا کر بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اپنی بات نہایت ہی سادہ الفاظ میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اپنے جملوں میں الفاظ کا چناؤ بہت احتیاط سے کرتے ہیں اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہمارے مخاطب کی سمجھ میں بغیر کسی دِقت کے آ جائیں۔ بعض مرتبہ تو ہم اپنے چھوٹے بچوں کو بات سمجھانے کے لیے، ان ہی کے انداز میں تُتلا تُتلا کے بات کرتے ہیں تا کہ وہ بچہ ہماری بات سمجھ جائے۔

دوستو! قانون کا سب سے پہلا اور مسلمہ اصول ہی یہ ہے کہ، وہ اتنا سادہ اور عام فہم ہو جو ہر کسی کی سمجھ میں آ جائے۔ کبھی ٹریفک کے ان نشانات پر غور فرمائیں۔ آخر کیوں یہ نشانات بنائے جاتے ہیں؟ اگر روڈ پر لگے کسی بورڈ پر لکھا ہو کہ "یہاں گاڑی کھڑی کرنا منع ہے" تو اسکے ساتھ ہی ایک گاڑی بنا کر اس پر کراس کا نشان لگا دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے ہی نہ کہ وہ لوگ جو پڑھ نہیں سکتے اس نشان سے بات سمجھ لیں۔ لیکن یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ جو کام ہم خود کرنا پسند نہیں کرتے وہ اللہ کے کھاتے میں ڈالنے میں ذرہ برابر خوف محسوس نہیں کرتے۔

ہمارے یہ نام نہاد علماء بڑے دھڑلے سے اس رب کائنات پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے جو کتاب نازل کی وہ معاذ اللہ ایک بے ربط، مبہم، متضاد اور مشکل کتاب ہے۔ اور اسے سمجھنے کے لیے ان علماء کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جو ہمیں اس کتاب اللہ کا بزعم خود، مفہوم بیان کر کے سمجھا سکیں کہ دیکھو۔۔۔

" قرآن میں یہ جو ہاتھی لکھا ہوا ہے دراصل یہ ہاتھی نہیں بلکہ اونٹ ہے اور معاذ اللہ اس رب نے تمہیں الجھانے کے لیے اسے ہاتھی کہا ہے"

دوستو! بہت زیادہ تفکر کی درخواست کرتا ہوں۔ غور فرمائیں۔ کتنا بڑا بہتان ہے یہ اس رب کائنات پر کہ جو اپنے بندوں پر ہر لمحہ مہربان ہے۔ ذرا سوچیے کہ ایسی کتاب نازل کرنے کا کیا فائدہ جو ہماری سمجھ میں ہی نہ آسکے؟ تو کیا ایسی کتاب نازل کر کے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اس رب نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے؟ نہیں۔ ہر گز نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ان نام نہاد مذہب کے ٹھیکیداروں نے اپنی دکانداری چلانے کے لیے اس قسم کے پروپیگنڈے کیے، ایسے نظریات کا پرچار کیا تاکہ لوگ اپنی فہم و فراست اور شعور کی بنیاد پر خود ہی اس کتاب کے ذریعے ہدایت نہ پا جائیں۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو ان کی دکانداری کا کیا ہوگا؟ یہ وہ ابلیسی حکمت عملی ہے جس کی طرف علامہ اقبال علیہ رحمہ نے اپنی شہرہ آفاق نظم "ابلیس کی مجلس شوری" میں اشارہ کیا تھا۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور پھر اس نے آخر میں اپنے چیلوں کو یہ نسخہ دیا کہ

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو، مزاج خانقاہی میں اسے

دوستو! آیئے ہم اس قرآن سے پوچھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ" (54:17)

اور البتہ ہم نے تو سمجھنے کے لیے قرآن کو آسان کر دیا پھر کوئی ہے کہ سمجھے (ترجمہ: احمد علی)

سورہ قمر کی اس آیت مبارکہ کو اللہ کریم نے متواتر، چار بار بتکرار بیان فرمایا ہے۔ کیا یہ آیت مبارکہ ہمارے ان نام نہاد علمائے دین کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی جہاں وہ مالک و خالق، جس نے اس کتاب کو نازل فرمایا، وہ خود کہہ رہا ہے

کہ ہم نے اس کتاب کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔ اب جس کتاب کو صاحب کتاب خود آسان بیان کر رہا ہے اس کتاب کو دنیا کی مشکل کتاب قرار دے کر ہمارے یہ علماء کیا توہین ربی اور توہین قرآن کے مرتکب نہیں ہوتے؟ اور صرف یہ ہی نہیں کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔ للذکر۔ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ" ذکر" کا معنی، نصیحت ہوتا ہے۔ کیا کوئی ایسی تحریر جو ہماری سمجھ میں ہی نہ آسکے، ہم اس سے کسی قسم کی کوئی نصیحت حاصل کر سکتے ہیں؟ اور پھر اس " ذکر" کے لیے فرمایا۔

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (15:9)

بیشک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے،(ترجمہ:طاہر القادری)

ذرا اپنی عقل فکر سے سوچیے۔ کیا فائدہ ہے کسی ایسی کتاب کو نازل کرنے کا اور اس کی حفاظت کرنے کا اگر وہ کتاب مبہم ہو، مشکل ہو، متضاد ہو، نامکمل ہو، جسے سمجھنے کے لیے اپنے جیسے کسی انسان کی ضرورت ہو، کسی علامہ، مولانا، مفتی اور مفکر کی ضرورت ہو؟ اور ظاہر ہے کہ امت کی اکثریت تو عامی لوگوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے تو پھر اللہ کا یہ وعدہ معاذ اللہ ایک فریب ہی ہوا کہ یہ کتاب تمام انسانوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے۔

میرے دوستو! اگر میں قرآن کے دلائل دینا شروع کر دوں تو صفحوں کے صفحے لکھے جاسکتے ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے ایسا کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس رب نے اپنی مخلوق کی درست راہنمائی کے لیے اس کتاب عظیم کو نازل فرمایا۔ نہایت ہی آسان اور عام فہم انداز میں، اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، نہ ہی کوئی تضاد ہے اور دین سے متعلق کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جسے اس خالق کائنات نے تشنہ چھوڑ دیا ہو۔ اللہ کریم نے اپنی مشیت کے مطابق 23 سال کے عرصہ میں اس کتاب عظیم کو بتدریج نازل فرمایا۔ اس کے اولین مخاطبین کی اکثریت نہ تو علامہ تھی اور نہ ہی مولانا بلکہ ان لوگوں کی اکثریت تو عام لکھنے پڑھنے کے قابل بھی نہ تھی۔ اور خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی درس گاہ سے پڑھے لکھے نہ تھے۔ تو پھر وہ کیا وجہ تھی کہ جو کہا جا رہا تھا وہ سب کی سمجھ میں آرہا تھا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں آرہا تھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں

بھی وہی کچھ آ رہا تھا۔ قرآن کریم میں تقریباً چودہ بار لفظ "یسئلونک" کا استعمال ہوا ہے۔ کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ لوگ پوچھتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں، 23 سال کا عرصہ اور پورا قرآن اور صرف 14 مرتبہ ان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کو کسی ہدایت کی مزید تشریح کی ضرورت پڑی۔ ورنہ جو کچھ دیا جارہا تھا سب کی سمجھ میں حرف بہ حرف آرہا تھا اور کوئی کنفیوژن ہی نہ تھی۔

بات صرف اتنی ہے کہ ہم اپنے ذہنوں سے خود ساختہ انسانی نظریات کو الگ کر کے کتاب اللہ کو صرف اور صرف عربی کی ایک کتاب سمجھ کر اس کا مطالعہ کریں۔ اس پر تفکر و تدبر کریں تو اس میں کوئی پیچ وخم نہیں ہے، کوئی مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ اس خالق کائنات نے اس کتاب عظیم کو سمجھنے کے بنیادی اصول بھی خود اس کتاب میں عطا فرمادئے ہیں۔ اگر ہم قرآن فہمی کے ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر اللہ کی کتاب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو میرا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب ہم سے باتیں کرنا شروع کردے گی۔ بخدا، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ اس کتاب عظیم نے مجھے زندگی کے کسی موقع پر مایوس نہیں کیا اور قرآن فہمی کا پہلا اصول جو قرآن بیان فرمارہا ہے وہ یہ ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُون (12:2)

بیشک ہم نے اس کتاب کو قرآن کی صورت میں بزبانِ عربی اتارا تا کہ تم (اسے براہِ راست) سمجھ سکو،

(ترجمہ: طاہر القادری)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (16:103)

اور بیشک ہم جانتے ہیں کہ وہ (کفار و مشرکین) کہتے ہیں کہ انہیں یہ (قرآن) محض کوئی آدمی ہی سکھاتا ہے، جس شخص کی طرف وہ بات کو حق سے ہٹاتے ہوئے منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن واضح و روشن عربی زبان (میں) ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

آیات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور ظاہر ہے کہ زبان مشتمل ہوتی ہے الفاظ پر اور یہ کہ قرآن کریم کے الفاظ خود اختیاری نہیں بلکہ نزولی ہیں۔ نیز یہ کہ معنی و مفہوم الفاظ ہی کے ہوتے ہیں جو ان الفاظ میں ہی محفوظ ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں موجود ہر لفظ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد مقام، معنی و مفہوم کا حامل ہے

اور یہ الفاظ کسی دوسرے مترادف الفاظ سے تبدیل نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ لازم ہے کہ ہم اس کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کو سیکھیں۔ اور اس عربی زبان کی ہر صنف یعنی محاورہ، اشعار، استعارے اور مثالیں وغیرہ وغیرہ سے مکمل آشنائی حاصل کریں۔

فہم قرآن کے لیے اللہ کریم نے پہلی ہدایت تو یہ ہی دے دی ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے عربی جاننا لازم ہے۔ اس کے بعد، اس رب کریم نے اس کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے وہ بنیادی اصول بیان کر دیئے ہیں جن کو مد نظر رکھ کر ہم کسی مفتی، مولوی، علامہ وغیرہ کی محتاجی کے بغیر، اپنی جنت تعمیر کر سکتے ہیں۔

1۔۔ قرآن کریم کی زبان عربی مبین ہے۔۔

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۴۳:۳)

بیشک ہم نے اسے عربی (زبان) کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ سمجھ سکو، (ترجمہ: طاہر القادری)

مزید ارشاد فرمایا۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۔۔ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ۔۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (۲۶:۱۹۵)

اور بیشک یہ (قرآن) سارے جہانوں کے رب کا نازل کردہ ہے۔۔ اسے روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) لے کر اترا ہے،۔۔ آپ کے قلبِ (انور) پر تاکہ آپ (نافرمانوں کو) ڈر سنانے والوں میں سے ہو جائیں،۔۔ (اس کا نزول) فصیح عربی زبان میں (ہوا) ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

چنانچہ قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے، کہ عربی زبان کے اصول و قواعد، اور اس کے سہ حرفی مادوں اور عربی گرامر کو ہر گز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

آیت بالا اس بات کو واضح کر رہی ہے، کہ اللہ کریم نے قران کریم، عربی مبین میں نازل فرمایا۔ واضح عربی زبان میں نازل فرمایا۔ ایسی زبان جس میں کوئی ابہام نہ ہو، نہ ہی کوئی لسانی پیچیدگی ہو، ایسی زبان مرکزی شہروں کی زبان ہوتی ہے۔ جہاں علم وادب کے چرچے ہوتے ہیں۔ دیہاتی اور بدوی زبان کو لسان عربی مبین ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔ آج بھی ہمارا مشاہدہ ہے، کہ دیہاتی زبان میں اکھڑ پن ہوتا ہے۔ ابہام ہوتا ہے۔ لیکن شہر کی زبان صاف اور شُشتہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی زبان، عربی مبین، ام القریٰ، مکۃ المکرمہ کی زبان ہے۔ یہ زبان دور جاہلیت کے بدونہ لٹریچر اور شاعری کی محتاج نہیں۔

2۔۔ قرآن کریم ہماری روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہے۔۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ (۵۱:۲۳)

تو آسمان اور زمین کے رب کی قسم بیشک یہ قرآن حق ہے ویسی ہی زبان میں جو تم بولتے ہو، (ترجمہ: احمد رضا خان)

آیت مبارکہ اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ اس کا انداز کلام ایسا ہے جیسے اس وقت کے لوگ آپس میں باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ جس طرح روزمرہ کی بول چال میں ہم، حقیقت و مجاز، استعارات، تشبیہات، محاورات، وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں، بلکل اس ہی طرح قرآن کریم میں بھی حقیقت و مجاز، تشبیہات، استعارات، محاورات، سب کچھ موجود ہیں۔

3۔۔ الفاظ کا استعمال باانداز مجاز۔۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ۔۔(۲:۹۳)

ان کے دلوں میں بچھڑا پلا دیا گیا۔ مفہوم

اب ظاہر ہے کہ کسی انسان کے دل میں بچھڑا گھول کے تو نہیں پلایا جاسکتا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ بچھڑے کی یخنی بنا کر پلا دی گئی۔ یا ان کے دلوں میں آپریشن کر کے انڈیل دی گئی ہو۔ اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پوری طرح رچ بس گئی تھی۔۔

چنانچہ آیت بالا دے واضح ہوا کہ قرآن کریم میں الفاظ کا استعمال بانداز مجاز بھی موجود ہے۔ چنانچہ جب بھی قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی، اس بات کا دھیان رکھنا ہو گا کہ کون سے الفاظ، اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، اور کون سے بانداز مجاز۔

4۔۔ الفاظ کا استعمال بانداز استعارات۔۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا (۷۶:۱۹)

اور ان کے اِرد گرد ایسے (معصوم) بچے گھومتے رہیں گے، جو ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے، جب آپ انہیں دیکھیں گے تو انہیں بکھرے ہوئے موتی گمان کریں گے، (ترجمہ: طاہر القادری)

آیات بالا میں "لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا" سے مراد، تازگی اور درخشندگی ہے۔ یعنی ان بچوں کی تازگی اور درخشندگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں کہا جارہا ہے کہ یہ بچے سچ مچ پتھر و جواہرات کے بنے ہوئے ہیں۔

چنانچہ آیت بالا میں ان الفاظ کو، بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

5۔۔کتاب اللہ ہونے کی دلیل۔۔اس کی آیات میں کوئی باہمی تضاد نہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴:۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی(ترجمہ:ابوالاعلی مودودی)

آیت بالا اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ قرآن کریم کی آیات مبارکہ میں کہیں بھی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن کریم کی کوئی بھی آیت مبارکہ ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کریم کی نازل کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ اس کے بیان میں، عام انسانوں کی طرح باہمی تضادات نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن کریم کی کسی آیت مبارکہ کا کوئی بھی ایسا ترجمہ یا مفہوم، جو قرآن کریم کی کسی دوسری آیت مبارکہ سے متصادم ہو، درست نہیں ہو گا۔

6۔۔تصریف آیات۔۔

انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (۶:۶۵)

دیکھو ہم کس طرح آیات کو پلٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں کہ شاید ان کی سمجھ میں آجائے

(ترجمہ:سید ذیشان حیدر جوادی)

تصریف آیات، قرآن فہمی کا بنیادی طریقہ ہے۔ اللہ کریم نے قرآن کریم کے الفاظ و آیات کو، مختلف مقامات، پر اس مقام کے مخصوص سیاق وسباق، اور واقعات کے پس منظر میں بار بار، دوہرایا ہے۔ تاکہ کسی بھی لفظ یا آیت کا حقیقی

مفہوم سامنے آجائے۔ چنانچہ، قرآن کریم اپنی لغت آپ ہے۔ تصریف آیات کے ذریعے اللہ کریم نے قرآن کریم میں استعمال ہونے والے ہر لفظ کے حقیقی معنی و مفہوم کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

زندگی نے موقع دیا تو اس سلسلہ "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآن" کے دوسرے حصے میں دیگر قرآنی اصولوں کو ترتیب وار بیان کر دوں گا۔

# عقیدہ جبر

تاریخ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ انسان اپنی جبلت میں آزاد اور خود مختار واقع ہوا ہے۔ خالق کائنات نے اپنی مشیت کے تحت اس مخلوق کو سوچنے، سمجھنے اور اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق عمل کی صلاحیت اور طاقت عطا فرمائی۔ تاریخ انسانی اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اس زمین پر پہلے انسانی قدم سے لے کر آج تک مستبد اور طاغوتی قوتوں نے ہمیشہ انسان سے اس کا یہ طرہ امتیاز چھیننے کی کوشش کی۔ کبھی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر، کبھی زیادہ عقل اور فہم کی صلاحیت کے مالک ہونے کی بنیاد پر۔ پھر چشم آسمان نے یہ منظر بھی دیکھے جب زیادہ عقل اور فہم کے مالک انسانوں نے، اپنے سے کم عقل اور سادہ لوح انسانوں کو مختلف حیلوں سے اپنا غلام بنانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنی عقل و فہم کی بہتر صلاحیت کی بنیاد پر، وسائل رزق پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح سے ان لوگوں نے انسانوں کو ان کی ضروریات کا محتاج بنا دیا اور روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض اپنے جیسے انسانوں کو ذہنی اور جسمانی غلامی میں جکڑ دیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جب بھی موقع ملا اس نے غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی اور اکثر کامیاب رہا۔

کمزور وناتواں، طاقت حاصل کر لینے کے بعد اور مفلس ونادار، مال کے حاصل کر لینے کے بعد، غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کر خود کو آزاد کروالیا کرتے تھے کمزور اور طاقت ور کی یہ جنگ، مسلسل جاری وساری رہتی تھی۔

جبر اور قدر کی اس مسلسل جنگ نے ان مستبد قوتوں کو اس بات کا ادراک عطا کیا کہ انسان کی مجبوریوں کو طویل عرصہ تک جاری وساری نہیں رکھا جا سکتا اور جب بھی انسانی مجبوریاں ختم ہوں گی لوگ ان کی غلامی سے نکلتے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ایسا حل سوچا جہاں انسان برضا ورغبت، بغیر کسی احتجاج کے ان کی خواہشات پر چلتا چلا جائے اور کبھی بغاوت نہ کرے۔ چنانچہ اس مقام پر آکر ان مستبد اور طاغوتی قوتوں نے اس مسلسل جنگ کے خاتمے کے لیے مذہبی پیشوائیت کو میدان میں اتارا۔

مذہبی پیشوائیت نے ان سادہ لوح انسانوں کو باور کروایا کہ کائنات میں کوئی بھی کام خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا۔ انہوں نے ان معصوم لوگوں کے ذہنوں میں یہ عقیدہ ڈالا کہ کائنات میں ایک پتہ بھی خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ چنانچہ اگر تم کمزور اور محکوم ہو تو یہ ہی خدا کی مرضی ہے اور اگر کوئی حاکم اور بالا دست ہے تو یہ بھی خدا ہی کی مشیت ہے۔

اس نے انسانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ بادشاہ، زمین میں خدا کا سایہ ہے۔ جس نے بادشاہ کی توہین کی گویا اس نے خدا کی توہین کی۔ اس طرح اس مذہبی پیشوائیت نے انسانوں کو اس عقیدہ جبر کا غلام بنا دیا جس میں اس کی مرضی اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنی محکومی اور محرومی کو منشائے خداوندی مان کر اس کے خلاف جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے مقدر پر راضی ہو گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس مذہبی پیشوائیت نے اپنی ایک الگ سلطنت قائم کر لی۔ لوگوں کو خدا کے نام پر اپنے مفادات کا غلام بنا ڈالا۔ اور انہیں عقیدہ جبر کا اسیر کر دیا، جہاں ان کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ گویا خدا کا حکم تھا۔ انسانی بدنصیبی کا یہ دور ہنوز قائم و دائم ہے۔ مذہب کی یہ گرفت آج بھی کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ پر قابض ہے۔

مذہبی پیشوائیت کے اس گمراہ کن عقیدہ جبر کے رد کے لیے خالق کائنات نے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لئے ہر دور میں اور ہر قوم میں اپنے پیغام رساں بھیجے۔ جنہوں نے انسانوں کو اس باطل عقیدہ سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کی۔ خدا کے ان پیغمبروں نے انسانوں کو عقیدہ قدر سے روشناس کروایا۔ انہیں بتایا کہ کائنات میں اس کے خالق نے ہر شئے کا ایک قانون بنا دیا ہے۔ ان قوانین کی بنیاد پر ہر انسان کے عمل کا ایک نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ انسان اپنے عمل کے لیے آزاد اور خود مختیار ہے البتہ اس کے عمل کے نتائج ان اٹل قوانین کے مطابق ہی بر آمد ہوں گے اور کسی کو بھی ان میں ردوبدل کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ انسان اپنے عمل اور ان کے نتائج کا ذمہ دار ہے۔ اچھے عمل کے اچھے نتائج اور برے عمل کے برے نتائج۔ نہ اس کے غلط عمل کی سزا کسی اور کو ملے گی اور نہ ہی اس کے اچھے اعمال کے صلے میں کوئی کمی کی جائے گی۔ اور یہ ہی تعلیم آج ہمارے پاس اس رب کریم کے آخری پیغام میں ہماری راہنمائی کے لیے محفوظ ہے۔ انسانی ارادے اور عمل کے اختیار کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ فرمایا

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (11:118)

اور اگر آپ کا پروردگار چاہ لیتا تو سارے انسانوں کو ایک قوم بنا دیتا (لیکن وہ جبر نہیں کرتا ہے) لہذا یہ ہمیشہ مختلف ہی رہیں گے (ترجمہ: سید ذیشان حیدر جوادی)

ظاہر ہے کہ جب اس نے ایک مخلوق پیدا فرمائی، اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی۔ عمل کی طاقت عطا فرمائی۔ تو اس کے اس اختیار پر کسی بھی طرح کی کوئی قدغن اس منشاء ہی کے خلاف ہے جس کے مطابق اس رب کریم نے انسان کو اس نعمت وصلاحیت سے سرفراز فرمایا۔ کائنات میں موجود ساری کی ساری مخلوق مجبور محض ہے۔ تخلیق انسانی کا مقصد ایک مزید مجبور محض کا اضافہ ہر گز نہیں تھا۔ بلکہ اس کی مشیت یہ تھی کہ ایک بااختیار مخلوق اپنی آزادانہ رائے سے مشیت کے اس پروگرام پر عمل کرے، جس کے لیے اس عظیم الشان کارگہ حیات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے دین کے حوالے سے واضح طور پر فرمادیا۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (76:2)

بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا فرمایا جسے ہم (تولّد تک ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی طرف) پلٹتے اور جانچتے رہتے ہیں، پس ہم نے اسے (ترتیب سے) سننے والا (پھر) دیکھنے والا بنایا ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (76:3)

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

مزید فرمایا۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ (18:29)

صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

مزید ارشاد فرمایا۔

لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (2:256)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

آیات بالا، انسان کے ارادے کی طاقت اور عمل کی آزادی کا واضح اعلان ہیں۔ اس ضمن میں انسان پر کسی طرح کی کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ عمل کی آزادی ہے۔ لیکن تمہارے اعمال کے نتائج ان قوانین خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے جن کو اللہ کریم نے واضح بیان فرمادیا۔ چنانچہ انسانی عمل کے نتائج کے حوالے سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاء فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (41:46)

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اُسی پر ہو گا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

مزید فرمایا۔

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ (99:7)

تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ (99:8)

اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے (بھی) دیکھ لے گا، (ترجمہ: طاہر القادری)

مزید ارشاد فرمایا۔

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَى (53:36)

کیا اُسے اُن (باتوں) کی خبر نہیں دی گئی جو موسٰی (علیہ السلام) کے صحیفوں میں (مذکور) تھیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى (53:37)

اور ابراہیم (علیہ السلام) کے (صحیفوں میں تھیں) جنہوں نے (اللہ کے ہر امر کو) بتمام و کمال پورا کیا (ترجمہ: طاہر القادری)

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (53:38)

یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53:39)

اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی(ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى (53:40)

اور یہ کہ بیشک اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی(ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاء الْأَوْفَى (53:41)

پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا(ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنتَهَى (53:42)

اور یہ کہ (بالآخر سب کو) آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے،(ترجمہ: طاہر القادری)

آیات بالا، اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتی ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نفع اور نقصان کا ذمہ دار ہے جس طرح کسی انسان کے برے اعمال کے نتیجہ میں کسی دوسرے انسان کو سزا نہیں دی جا سکتی، بالکل اس ہی طرح انسان کے اچھے اعمال کے اچھے نتائج میں بھی کسی کو زبردستی شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر انسان اپنے حصے کا بوجھ خود اٹھائے گا۔

# انفاق

اگر ہم انسانیت کو درپیش مسائل، کسی ایک جملہ میں واضح کرنا چاہیں تو وہ اس کے معاش کا مسئلہ ہے۔ روٹی کا مسئلہ ہے۔ انسان کی ساری تگ ودو، اس ایک مسئلہ کے گرد گھومتی ہے۔ انسان کی تمام مشکلات کی جڑ صرف یہ ایک مسئلہ ہے۔ جسے انسان آج تک حل کرنے میں ناکام ہے۔ اپنے اردگرد، بھوک سے بلکتے ہوئے انسان، اسپتالوں میں دواؤں کو ترستے ہوئے انسان، چاردیواری کی آرزو میں مرتے ہوئے انسان، اپنے بچوں کے اچھے مستقبل اور ان کی اچھی تعلیم وتربیت کی خواہش میں سسکتے ہوئے انسان، یہ مناظر دیکھ کر کوئی بھی حساس دل چین کی نیند نہیں سو سکتا۔ چنانچہ ہر دور میں حساس انسانوں نے اپنے اردگرد کے ان اذیت ناک مناظر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن آج تک ان کی یہ کاوشیں، بارآور ثابت نہیں ہو سکیں۔

پچھلی صدی عیسوی میں، ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک نظام کو بنتے اور پھر اسے ناکام ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ نظام کمیونزم، سوشلزم تھا۔ جس کے بانی ہیگل، مارکس اور ان کے دیگر رفقاء تھے۔ یہ معاشرے کے وہ حساس لوگ تھے جنہوں نے اپنی عقل کے مطابق، انسانوں کو درپیش اس معاشی مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں کیں۔ ان حساس لوگوں نے بزعم خود اس انسانی مسئلے کے مرض کی تشخیص کی۔ لیکن اس کا شافی علاج اور اس کے نفاذ کا کوئی طریقہ ان کے پاس نہ تھا۔ انہوں نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا کہ مختلف انسانوں میں کسب معاش کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی انسان زیادہ کمالینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کوئی کم کماتا ہے۔ ان لوگوں نے اس بات کا ادراک بھی حاصل کر لیا کہ سارے فساد کی جڑ وسائل رزق کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہے۔ انہوں نے یہ بھی جان لیا کہ ان وسائل رزق کو معاشرے میں مسلسل گردش کرتے رہنا چاہیے۔ اس حقیقت تک پہنچنے کے بعد انہوں نے اس کا یہ

حل پیش کیا کہ معاشرے کے ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق کمانا چاہیے۔ اور اپنی ضرورت سے زائد باقی سب کچھ معاشرے کو لوٹا دینا چاہیے۔ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ

1۔ کوئی ایسا کیوں کرے گا؟

2۔ لوگوں کی ضروریات کا تعین کیسے ہو گا اور کون کرے گا؟

یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان کی ساری زندگی، اس کی ساری تگ و دو، بھاگ دوڑ، محنت یہ سب کچھ اس جذبہ مسابقت کی وجہ سے ہے، جس کے نتیجے میں ہر انسان اپنے سامنے والے انسان سے آگے نکلنے کی خواہش میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔

اگر انسان میں یہ جذبہ مفقود ہو تو یہ انسان، مٹی کا ایک ڈھیر ہی رہ جاتا ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ جو اس جذبہ سے عاری ہوتے ہیں وہ ساری عمر کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں ہی سفر کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو آگے بڑھنے کی جستجو لئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ ترقی و خوشحالی کی منازل پر منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب یہ ہی سوال اس وقت کے لوگوں نے اپنے وقت کے عظیم مفکر مارکس سے کیا کہ "جب کوئی انسان اپنی ضرورت سے زائد آمدنی دوسروں کو دینے کا پابند ہو، تو پھر وہ زائد محنت کیوں کرے گا؟" اور اس کے جواب میں مارکس کا یہ تاریخی فقرہ کتابوں میں آج تک محفوظ ہے۔ اس نے کہا" میں نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کرے گا، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انسانیت کو درپیش اس مسئلہ عظیم کا یہ ہی واحد حل ہے"۔

اس کے بعد، اس نظام کے پیروکاروں نے ایسا کرنے کے لیے وہ ہی راستہ اختیار کیا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ بلکہ انہوں نے اس ضمن میں اپنے پیشرؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے عقیدہ جبر کو بروئے کار لا کر طاقت کے زور پر انسانوں سے ان کے اثاثے چھین لیے۔ ریاست کے نام پر لوگوں کا مال، ان کے کاروبار، ان کی فیکٹریاں قومی ملکیت میں لے لی گئیں۔ اور اس طرح ظلم و استبداد کے اس انفرادی نظام کے مقابل جو نظام سرمایہ داری میں موجود تھا، ایک گروہ "حکومت اور ریاست کے نام پر" لوگوں پر مسلط ہو گیا۔ اور وہ سب کچھ، جو شاید سرمایہ داری نظام بھی نہ کر

سکا ان لوگوں نے کر لیا۔ اور پھر ظلم اور استبداد کا یہ نظام، ایک صدی بھی اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا اور اپنے بوجھ تلے دب کر خود ہی فنا ہو گیا۔

پچھلی صدی عیسوی میں ہی وہ عظیم دانشور، مدبر ہمارے سامنے آتے ہیں، جنھوں نے قرآن کریم پر محنت کی۔ اس کے روایتی اور تقلیدی تراجم اور تفاسیر سے ہٹ کر، اسکی وہ درخشاں و تابناک تعلیم ہمارے سامنے لانے کی سعی کی جسے مذہبی پیشوائیت نے اپنے مفاد کی خاطر ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ ہمارے یہ محسن، بھی نہایت حساس واقع ہوئے تھے۔ ان کا دل بھی انسانوں کی ذلت، رسوائی، جہالت، بھوک اور ننگ دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ ان لوگوں نے قرآن کریم کے معاشی نظام کو سامنے لانے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا، کہ دین اس مسئلہ عظیم کے حوالے سے کیا کہتا ہے۔

لیکن جس طرح کوئی بھی انسان، اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس ہی طرح ہمارے یہ محترم اکابرین بھی اپنے دور کے ان فلسفوں اور رجحانات سے جو کمیونزم اور سوشلزم نے دیئے تھے خود کو مکمل طور پر محفوظ نہ رکھ سکے۔ اور غیر دانستہ طور پر ہمارے ان محترم اکابرین نے اس مسئلہ کے حوالے سے موجود قرآنی ہدایات اور قوانین کو کمیونزم اور سوشلزم کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہمارے ان بزرگوں نے ایسے خیالات اور عقائد قرآن کریم کے نام پر ہمارے سامنے پیش کیے جو میری فہم کے مطابق درست نہیں ہیں۔

ان کے پیش کردہ یہ نظریات در حقیقت، کمیونزم ہی کا پرچار ہیں۔ جسے ہمارے ان بڑوں نے قرآن کریم کی مختلف آیات کا مفہوم اور تفسیر کرتے ہوئے پیش کیا ہمارے ان بڑوں نے اس ضمن میں جو بنیادی نکات پیش کیے وہ کچھ اس طرح سے ہیں۔

1۔ کوئی انسان زمین کا مالک نہیں ہو سکتا۔

2۔ نجی ملکیت کی اجازت نہیں۔

3۔ ہر انسان اپنی ضرورت سے زائد مال حکومت کو دینے کا پابند ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو ریاست بزور بازو وتعزیر اس سے یہ مال چھین سکتی ہے۔

4 ۔ تمام انسان معاشی لحاظ سے برابر ہونے چاہیے۔

## یَسْأَلُونَکَ مَاذَا یُنفِقُونَ

سوشلزم کے اس پر فریب نعرے "کماؤ صلاحیت کے مطابق، خرچ کرو ضرورت کے مطابق" کی تائید میں ہمارے ان محترم اکابرین نے پورے قرآن کریم سے سورہ بقرہ کی آیت مبارکہ نمبر 219 کا انتخاب کیا۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس آیت مبارکہ کا من مانا ترجمہ یا مفہوم بیان کر کے، سوشلزم کے، اس غیر فطری اور گمراہ کن نعرے کو قرآنی سند عطا کرنے کی غلطی کی۔ اور اس واحد آیت مبارکہ کے اس من مانے ترجمے کی بنیاد پر اسلام کے معاشی نظام کی ایسی تصویر پیش کی گئی جو عملی طور پر ناممکن العمل ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں سے لے کر آج تک کی مسلمانوں کی تاریخ اس غیر قرآنی، خود ساختہ، تصوراتی نظام کے حوالے سے مکمل طور پر خاموش ہے۔ یہ تصوراتی نظام نہ ماضی میں کسی خطہ زمین پر قائم ہو سکا اور نہ آئندہ کبھی قائم ہو سکے گا۔ آیئے ایک نظر اس آیت قرآنی پر ڈالتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"یَسْأَلُونَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیهِمَا إِثْمٌ کَبِیرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَکْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا وَیَسْأَلُونَکَ مَاذَا یُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ کَذَٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْآیَاتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُونَ" (2:219)

پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔ (ترجمہ: ابو الاعلیٰ مودودی)

دوستو، بہت زیادہ غور فکر کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو اس آیت مبارکہ کا اسلوب ملاحظہ فرمائیں۔ وہ قرآن جو انسانوں کے چھوٹے چھوٹے معاملات پر ضروری اور مناسب تفصیل سے بات کرتا ہے قرض کا لین دین ہو، ماہ رمضان کے روزے ہوں، لوگوں کے گھروں میں آنا جانا ہو، دعوت کا معاملہ ہو، کھانے پینے کے آداب ہوں۔ قرآن کریم انسانوں کو مناسب اور ضروری تفصیل کے ساتھ ایسی ہدایات عطا فرماتا ہے کہ کوئی کنفیوژن ہی نہیں رہتی۔ لیکن

انسانوں کو درپیش سب سے اہم مسئلہ، جس کے حل کے لیے ساری انسانیت صدیوں سے حیران وپریشان بھٹک رہی ہو، جو انسانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہو، اس کی ہدایت کے لیے اتنا سرسری انداز؟

اور پھر اس آیت مبارکہ کا آخری حصہ خاص طور پر قابل غور ہے، کہا" اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے"۔ ذرا غور فرمائیں۔ کیا اس ہی کو صاف صاف بیان کرنا کہیں گے۔ آیت مبارکہ کے پہلے حصے پر غور فرمائیں۔ کتنا واضح بیان ہے۔ کوئی کھٹک رہتی ہی نہیں۔ جب کہ اس کے دوسرے حصے کا یہ ترجمہ" کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو، وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دو" کیا کسی طرح سے بھی اس قرآنی دعوے کہ" اس طرح اللہ، تمہارے لیے، صاف صاف احکامات بیان کرتا ہے" کے زمرے میں آسکتا ہے؟

کیا یہ آیت صاف صاف بتارہی ہے کہ انسانی ضروریات کی کیاحدودوقیود ہوں گی؟

کیا یہ آیت صاف صاف بتارہی ہے کہ انسانی ضروریات کے کیااصول ہوں گے؟

کیا یہ آیت صاف صاف بتارہی ہے کہ انسانی ضروریات کاتعین کون کرے گا؟وغیرہ وغیرہ۔

بجائے ان باتوں کو واضح کرنے کے اپنی ضروریات کے تعین کا اختیار بھی ان ہی لوگوں کو دے دیا جائے جن سے یہ مال زبردستی لیا جارہا ہے اور ہمارے ان احباب کے بقول یہ سارے لوگ تو ہیں ہی سرمایہ دار، ظالم، جابر، مستبد۔ جو لوگوں کی خون پسینے کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ اور اس طرح سے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔

دوستو! قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (4:82)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔(ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

چنانچہ کسی بھی آیت قرآنی کا کوئی ایسا ترجمہ یا مفہوم جو اس کتاب عظیم کی عمومی اور بنیادی تعلیم یا اس کی کسی اور آیت مبارکہ سے متصادم ہو درست نہیں ہوگا۔ اللہ کریم مومنین کی ایک صفت یہ بیان کرتا ہے۔ فرمایا

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (59:9)

(اور وہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے) جو اِن مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اِن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کو دیدیا جائے اُس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

بہت غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مومن تو نام ہی تمام انسانوں کی سلامتی اور ان کے کام آنے کا ہے۔ مومن کبھی اس بات کا مکلف نہیں ہو سکتا کہ اگر کچھ میرے پاس بچ جائے تو میں دوسروں کو دوں۔ وہ ہرگز اس سفلی سوچ کا مالک نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ دوسروں کو دیا جانا چاہیے جو زائد از ضرورت ہو۔ بلکہ ان کے پیش نظر تو صرف یہ حقیقت ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ اس رب کی عطا ہے۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (16:53)

تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

اب اگر میرے کسی بھائی کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے تو پہلا حق اس ہی کا ہے۔ مومن ہمیشہ دوسروں کی ذات کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں۔ مومن جس بھی حیثیت کا مالک ہو وہ دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ اس کی اپنی ضرورت اور کسی اور بھائی کی ضرورت ایک جیسی نوعیت کی ہوں تو وہ پہلے دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، خواہ اس کی اپنی ضرورت رہ ہی کیوں نہ جائے۔ اور کسی کے کام آکر ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (76:9)

(اور اُن سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

وہ دوسروں کے کام آکر صرف اپنے حصے کا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کسی عمل کا صلہ کسی انسان سے نہیں مانگتے۔ نہ ہی اس حساب کتاب میں پڑے رہتے ہیں کہ اگر کچھ میری ضرورت سے زائد ہے تو ہی دینا ہے ورنہ نہیں۔ یہ اپنی ضروریات کو روک کر دوسروں کی ضرورت کو پورا کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا آیت مبارکہ 2:219 کا وہ

مفہوم جو ہمارے ان محترم اکابرین نے پیش کیا اور جس کو ہمارے دوست آنکھیں بند کر کے رٹے چلے جارہے ہیں اس آیت مبارکہ 59:9 سے متصادم نہیں ہے؟

قرآنی تعلیمات عقیدہ قدر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ قرآن عقیدہ جبر کے تصور کو ظلم اور ناانصافی کہتا ہے۔ وہ انسان کے اختیار اور ارادے کا احترام کرتا ہے۔ وہ انسان کے اس اختیار پر کسی زبردستی کا قائل نہیں۔ وہ انسان کو صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی کے بعد اپنی مرضی کے راستے کے انتخاب کی اجازت دیتا ہے۔ وہ انسان سے زبردستی کچھ بھی نہیں منوانا چاہتا۔ وہ اپنی تعلیمات سے انسان کے اندر ایسی تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے جو منشائے خداوندی ہے۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر اس بات کا اعلان کیا۔ فرمایا

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (2:256)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

دین انسان کے ساتھ کسی زبردستی کا قائل ہی نہیں۔ وہ اپنے پیروکاروں سے کوئی بھی بات ڈنڈے کے زور پر نہیں منوانا چاہتا۔ اگر انسان سے کچھ بھی زبردستی منوانا ہوتا تو پھر اسے انسان کو اختیار اور ارادے کی طاقت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ انسانی اعمال اور ان کے نتائج کے حوالے سے اس نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ

مَّنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ‌ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا‌ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (41:46)

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اُسی پر ہو گا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا ذمہ دار ہے۔ جس طرح کسی انسان کے غلط عمل کی سزا کسی دوسرے انسان کو نہیں دی جاسکتی بالکل اس ہی طرح یہ بات بھی عدل عام کے اصولوں کے خلاف ہو گی اگر کسی کے اچھے اعمال کے اچھے نتائج

میں کسی دوسرے انسان کو زبردستی شریک کر لیا جائے۔ اس نے متعدد مقامات پر اس مستقل اصول کو بیان کیا ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ فرمایا

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (53:38)

یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

مَّنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً (17:15)

جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اُسی پر ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق وباطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغام برنہ بھیج دیں۔ (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

اس نے واضح کر دیا ہے کہ انسان اپنے عمل کے اچھے یا برے نتائج کا واحد ذمہ دار ہے۔ ہر انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور اللہ کسی انسان کی عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53:39)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى (53:40)

اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى'' (53:41)

اور اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

کسی انسان کے عمل کی جزاء میں زبردستی کسی دوسرے انسان کی شرکت نہ انصاف کہلا سکتی ہے اور نہ منشائے خداوندی۔ چنانچہ آیت مبارکہ 2:219 کا پیش کردہ من مانا، تصوراتی مفہوم، آیات بالا سے براہ راست متصادم ہے۔ اس لیے باطل ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے دور کے چند دانشور، اس آیت قرآنی کی تعبیر اور تشریح میں، کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔ ان سے بہت بڑا سہو سرزد ہوا۔ جس نے اس آیت مبارکہ کے درست مفہوم کو ایک بالکل مختلف مفہوم سے بدل کر بات کو کچھ سے کچھ بنادیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کی ہے کہ ہمارے ان دانشوروں کا تعلق پچھلی صدی عیسوی کے اس دور سے ہے جب کمیونزم اپنے عروج پر تھا۔ اور ہمارے ان محترم اساتذہ کرام نے اس آیت مبارکہ کا مفہوم کمیونزم کے تناظر میں کرنے کی کوشش کی۔

میں اپنے اسلاف کے حوالے سے حسن ظن کا قائل ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارے ان سابقین نے نہایت ہی خلوص اور محنت سے دین کی خدمت کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے فہم اور شعور کی بنیاد پر جو درست سمجھا ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن ان میں سے کسی محترم بزرگ نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی تحقیق حرف آخر ہے۔ ان لوگوں نے ہمیشہ خود کو قرآن کریم کا ادنیٰ طالب علم ہی سمجھا اور کبھی خود کو دین میں سند قرار نہیں دیا۔

بد قسمتی سے ہمیشہ کی طرح بعد میں آنے والوں نے ان محترم اکابرین کو دین میں سند کا درجہ دے دیا۔ جو کچھ انہوں نے پیش کیا اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا۔ اور اگر کسی نے ان اکابرین سے کسی موضوع پر اختلاف کیا تو اسے، کافر، فاسق، سود خور، سرمایہ دار اور قارون کے ساتھیوں جیسے القابات سے نوازا۔ اور نتیجہ مزید تفریق اور انتشار۔

آیئے ہم اس آیت قرآنی پر غور کرتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ، کوئی مومن، اپنی ضرورت سے زائد مال اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اور اسے اپنی ضرورت سے زائد مال ہر صورت ریاست کے حوالے کرنا ہو گا۔ اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے۔

"اے نبی تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کریں۔ ان سے کہہ دو جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب۔"

عربی زبان، لغت، گرامر اور اسکے کسی بھی قاعدے کی رو سے یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ آیت مبارکہ میں پانچ الفاظ ہیں۔

1۔ وَیَسْأَلُونَکَ

2۔ مَاذَا

3۔ یُنفِقُونَ

4۔ قُل

5۔العفو

دوستو! بہت اچھی طرح سے غور فرمائیں، ان پانچ کے پانچ الفاظ میں کیا کسی لفظ کا معنی ''اللہ کی راہ'' اور ''کتنا خرچ کریں'' موجود ہے؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم جب بھی قرآن کریم کا ترجمہ، اپنے مخصوص نظریات کو ذہن میں رکھ کر، انہیں ثابت کرنے کے نظریے سے کریں گے، تو ایسا ہی ہو گا۔ ورنہ سیدھی سادی آیت ہے اور سیدھا سادہ معنی۔ ہمارے دوستوں نے، اپنے پہلے سے طے شدہ نظریہ کے مطابق، اس آیت مبارکہ میں موجود لفظ'' انفاق'' کا معنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور'' ماذا'' کا معنی ''کتنا'' کر کے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

آیئے اب ہم اس لفظ'' ماذا'' کو قرآن کریم کی مدد سے، تصریف آیات کی رو سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ'' ماذا'' تقریباً 27 بار استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی ''کیا'' یا ''کون سا'' ہوتا ہے۔ ''کتنا'' ہرگز نہیں ہوتا۔ میں آیات پیش کرتا ہوں فرمایا۔

''یَسْأَلُونَکَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ '' (5:4)

لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے، (ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

غور فرمائیں، بالکل ایک جیسے الفاظ ہیں، وہاں کہا گیا

یَسْأَلُونَکَ مَاذَا یُنفِقُونَ

اور یہاں کہا جا رہا ہے

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ

اب اگر اس لفظ "مَاذَا" کا ترجمہ "کتنا" مانا جائے تو بات کیا ہو جائے گی کہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کتنا حلال ہے۔ غور فرمائیں کس قدر مضحکہ خیز بات ہو گی؟

مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ" (12:71)

وہ یوسف کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا تمہارا کیا گم ہو گیا ہے (جو ہمیں چور ٹھہراتے ہو) مفہوم القرآن جناب غلام احمد پرویزؒ

"وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ" (28:65)

پھر خدا ان سے کہے گا، (یہ معاملہ تو وہ ہوا جو تمہارے لیڈروں کے ساتھ پیش آیا، اب یہ بتاؤ کہ) جب ہمارے رسولوں نے خود تم تک ہماری دعوت پہنچائی تھی، تو تم نے ان کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا؟ مفہوم القرآن جناب غلام احمد پرویزؒ

"وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُواْ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّهُ وَكَانَ اللّهُ بِهِم عَلِيماً"(4:39)

اور ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا تھا اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرتے، اور اللہ ان (کے حال) سے خوب واقف ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

"يَوْمَ يَجْمَعُ اللّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُواْ لاَ عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنتَ عَلاَّمُ الْغُيُوبِ" (5:109)

جس روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا ہے، تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

"يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ" (7:110)

(لوگو!) یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے، سو تم کیا مشورہ دیتے ہو، (ترجمہ: طاہر القادری)

" إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ " (2:26)

اللہ اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔ جو مومن ہیں، وہ یقین کرتے ہیں وہ ان کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کی مراد ہی کیا ہے۔ اس سے (خدا) بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور گمراہ بھی کرتا تو نافرمانوں ہی کو (ترجمہ: فتح محمد جالندھری)

"يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ "(2:215)

آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو وہ ماں باپ کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے (ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

"وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ وَكَانَ اللَّهُ بِهِم عَلِيمًا"(4:39)

ان کا کیا نقصان ہے اگر یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئیں اور جو اللہ نے بطور رزق دیا ہے اسے اس کی راہ میں خرچ کریں اور اللہ ہر ایک کو خوب جانتا ہے (ترجمہ: سید ذیشان حیدر جوادی)

"فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ" (10:32)

تو یہ اللہ ہے تمہارا سچا رب پھر حق کے بعد کیا ہے مگر گمراہی پھر کہاں پھرے جاتے ہو،(ترجمہ: احمد رضا خان)

"قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتاً أَوْ نَهَاراً مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ"(10:50)

آپ فرما دیجئے: (اے کافرو!) ذرا غور تو کرو اگر تم پر اس کا عذاب (ناگہاں) راتوں رات یا دن دہاڑے آ پہنچے (تو تم کیا کر لو گے؟) وہ کیا چیز ہے کہ مجرم لوگ اس سے جلدی چاہتے ہیں؟، (ترجمہ: طاہر القادری)

"وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُواْ أَسَاطِيرُ الأَوَّلِينَ"(16:24)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے چلی آ رہی ہیں۔(ترجمہ: اشرف علی تھانوی صاحب)

" وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ "(16:30)

اور پرہیز گاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو کہتے ہیں اچھی چیز جنہوں نے نیکی کی ہے (ان کے لیے) اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور البتہ آخرت کا گھر تو بہت ہی بہتر ہے اور پرہیز گاروں کا کیا ہی اچھا گھر ہے (ترجمہ: احمد علی)

"يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ " (سورۃ الشعرا26:35)

اس کا ارادہ یہ نظر آتا ہے، کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر، یہاں اپنی حکومت قائم کر لے ۔اور تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے۔ سو بتاؤ تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے۔

(مفہوم: القرآن جناب غلام احمد پرویزؒ)

"اذْهَب بِّكِتَابِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ " (27:28)

میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

" قَالُوا نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ وَأُولُو بَأْسٍ شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانظُرِي مَاذَا تَأْمُرِينَ "(27:33)

انہوں نے کہا: ہم طاقتور اور سخت جنگ جو ہیں مگر حکم آپ کے اختیار میں ہے سو آپ (خود ہی) غور کر لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں،(ترجمہ: طاہر القادری)

"حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ " (27:84)

یہاں تک کہ جب (سب) آجائیں گے تو (خدا) فرمائے گا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلا دیا تھا اور تم نے (اپنے) علم سے ان پر احاطہ تو کیا ہی نہ تھا۔ بھلا تم کیا کرتے تھے (ترجمہ: فتح محمد جالندہری)

"وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ" (28:65)

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جبکہ وہ اِن کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ "جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

"هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ " (31:11)

یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ، ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں(ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

" إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ "(31:34)

بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے جانتا ہے۔ کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے (ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

" وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ۖ قَالُوا الْحَقَّ ۖ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ " (34:23)

اور اس کے پاس شفاعت کام نہیں دیتی مگر جس کے لیے وہ اذن فرمائے، یہاں تک کہ جب اذن دے کر ان کے دلوں کی گھبراہٹ دور فرمادی جاتی ہے، ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا ہی بات فرمائی، وہ کہتے ہیں جو فرمایا حق فرمایا اور وہی ہے بلند بڑائی والا، (ترجمہ: احمد رضا خان)

" قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ إِن يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُم بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا " (35:40)

فرما دیجئے: کیا تم نے اپنے شریکوں کو دیکھا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، مجھے دکھا دو کہ انہوں نے زمین سے کیا چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں (کی تخلیق) میں ان کی کوئی شراکت ہے، یا ہم نے انہیں کوئی کتاب عطا کر رکھی ہے کہ وہ اس کی دلیل پر قائم ہیں؟ (کچھ بھی نہیں ہے) بلکہ ظالم لوگ ایک دوسرے سے فریب کے سوا کوئی وعدہ نہیں کرتے، (ترجمہ: طاہر القادری)

" فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ " (37:102)

جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابرھیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراھیمؑ نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامر الٰہی) ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے وہ بولے کہ ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ (بلا تامل) کیجیۓ انشااللہ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے۔

(ترجمہ: جناب اشرف علی تھانوی صاحب)

" قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۖ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ" (46:4)

تو آپ کہہ دیں کہ کیا تم نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو ذرا مجھے بھی دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے یا ان کی آسمان میں کیا شرکت ہے - پھر اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ ہمارے سامنے پیش کرو (ترجمہ: سید ذیشان حیدر جوادی)

" وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ" (47:16)

اِن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو اُن لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی اِنہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں (ترجمہ: ابو الاعلیٰ مودودی)

" وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۙ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ" (74:31)

اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے بنائے ہیں اور ہم نے ان کی تعداد کو کافروں کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ اہلِ کتاب یقین کریں اور اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے اور اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان شک وشبہ نہ کریں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافرلوگ کہیں گے کہ اس بیان سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور یہ (دوزخ کا) بیان نہیں ہے مگر انسانوں کے لئے نصیحت۔
(ترجمہ: آیۃ اللہ محمد حسین نجفی)

دوستو! قرآن کریم کی کسی ایک آیت یا اس کے کسی حصہ کے غلط مفہوم سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں اس لفظ "ماذا" کے غلط ترجمہ نے آیت کا بنیادی مفہوم ہی تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ ہمارے بہت سارے ساتھیوں کا یہ موقف ہے کہ اس لفظ "ماذا" کا معنی ''کتنا'' ہو یا ''کیا'' ہو۔ بات ایک ہی ہے۔
یہ درست خیال نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں۔ آپ کسی دوکاندار کے پاس جاتے ہیں، دوکاندار اگر آپ سے یہ کہے کہ "جناب کیا چاہیے؟ تو آپ جواب میں کہیں گے، کہ چینی دے دو، آٹا دے دو۔ اس کے بعد وہ آپ سے یہ سوال کرے گا کہ کتنا آٹا دوں، کتنی چینی دوں۔ اب تصور کریں کہ وہ دوکاندار ابتداء ہی میں آپ سے کہتا ہے، جناب کتنا دوں۔ ذرا غور فرمائیں آپ کیا جواب دیں گے۔ آپ کی سمجھ میں کیا آئے گا؟
جب اس لفظ "ماذا" کا مفہوم آپ ''کتنا'' لیں گے جو درست نہیں ہے اور اس مفہوم کے ساتھ جب لفظ "قل العفو" کو شامل کریں گے تو اس کا معنی ان کے تصور کے مطابق یہ ہی نکلے گا جو ہمارے اکثر دوست کرتے ہیں کہ دیکھو اللہ خود فرمارہا ہے کہ تم اپنی ضرورت سے زائد کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ کوئی شخص ذاتی ملکیت کا مالک نہیں ہو سکتا۔ جو کاروبار کر رہا ہے وہ اپنا سارا کاروبار ریاست کے حوالے کر دے۔ جو فیکٹری چلا رہا ہے وہ اپنی فیکٹری ریاست کے حوالے کر دے۔ جس کے پاس جو کچھ بھی جائیداد ہے وہ اسے ریاست کے حوالے کر دے۔
اس مقام پر کوئی بھی اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پاتا کہ جب ایک دوکاندار اپنا سارا کاروبار ریاست کے حوالے کر دے گا تو پھر وہ اپنے بچوں کی روٹی کیسے کمائے گا؟ اگر کوئی فیکٹری کا مالک اپنی فیکٹری ریاست کے حوالے کر دے گا تو پھر وہ اپنے بچوں اور اس فیکٹری میں کام کرنے والے سینکڑوں مزدوروں کی روٹی کیسے حاصل کرے گا؟ اور

اگر یہ ہی طے ہے تو آخر الامر چند سالوں میں اس معاشرے میں نہ ہی کوئی دوکاندار رہے گا، نہ ہی کوئی فیکٹری کا مالک رہے گا، نہ کوئی زمین کا مالک رہے گا تو پھر یہ سارے بے روزگار کہاں جائیں گے۔ ان کی روٹی کا بندوبست کیسے ہو گا ؟اور اگر ریاست ان کی روٹی کی ذمہ دار ہے تو اس کے پاس وہ قارون سے بڑا خزانہ کہاں سے آئے گا جو ان سارے بے روزگاروں کی روٹی کا بندوبست کر سکے ؟

ہمارے ان سوالوں کا جواب ہمارے دوست یہ دیتے ہیں کہ جناب یہ ساری ملکیت، ریاست کی ہو گی اور وہ فیکٹری کا مالک، وہ دوکاندار، وہ زمیندار، یہ سب اپنی اپنی جگہ محنت کریں گے اور جو کچھ کمائیں گے، وہ ریاست کے پاس چلا جائے گا اور ریاست ان لوگوں کی ضروریات پوری کرے گی۔

جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر سب کچھ ریاست کے پاس چلا جائے گا اور ریاست ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دے گی تو کوئی بھی شخص اپنی ضرورت سے زائد کمانے کے لیے زیادہ محنت کیوں کرے گا۔

اس کا جواب ہمارے دوست یہ دیتے ہیں کہ، جناب ان لوگوں کے سامنے ایک جذبہ محرکہ ہے، جو کمیونزم کے پاس نہیں تھا۔ اور وہ جذبہ محرکہ یہ ہے کہ دینے سے اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے چنانچہ لوگ اس نظریہ سے ایسا کریں گے کہ ایسا کرنے سے ان کی ذات کی نشو و نما ہو جائے گی۔

اور جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ٹھیک بات ہے لیکن ذرا یہ بتائیں کہ جب وہ لوگ اتنے پختہ ایمان کے مسلمان ہوں گے، ان کا اس بات پر ایمان ہو گا کہ دینے سے ان کی ذات کی نشو و نما ہو جائے گی اور اس لیے وہ اپنی ضرورت سے زائد محنت کریں گے تا کہ دوسرے لوگوں کی ضروریات بھی پوری ہو جائیں، تو پھر آخر وہ لوگ اس وقت ہی کیوں ظالم و جابر بن جائیں گے جب وہ کسی کاروبار کے مالک ہوں گے، جب وہ کسی فیکٹری کے مالک ہوں گے۔ کیوں وہ لوگ اس حیثیت میں بھی اپنے بھائیوں کی ضروریات سے لا تعلق ہو جائیں گے ؟

کیوں وہ اپنے اس ہی بھائی کا استحصال کریں گے جس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بقول آپ کے وہ زیادہ محنت کریں گے۔

آپ غور فرمائیں۔ کتنا بڑا تضاد ہے۔ ظاہر ہے جب کوئی نظریہ جس کا قرآن سے کوئی تعلق ہی نہ ہو آپ زبردستی قرآن پر تھونپنا چاہیں گے تو آپ ایسے مبہم اور نا ممکن العمل پروگرام ہی پیش کر سکیں گے۔

ہمارے ان دوستوں کا یہ موقف بھی ہے کہ جناب تمام فساد کی جڑ فاضل دولت ہے۔ اس فاضل دولت کی وجہ سے ہی معاشرے میں سارا بگاڑ ہے۔ چنانچہ قرآن اس فاضل دولت کو ریاست کی ملکیت میں لے لینے کا حکم دیتا ہے۔

جب ان سے سوال کرتے ہیں کہ پھر وہ ریاست اور اس کے حکمران کیسے ظلم سے باز آجائیں گے۔ وہ کیوں نہیں ویسا ہی کریں گے جیسا کمیونزم میں ہوا۔ تو ہمارے دوست جواب دیتے ہیں کہ جناب آپ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں، وہ لوگ آج کے حکمرانوں جیسے نہیں ہوں گے۔ وہ بڑے پکے مومن ہوں گے، وہ بارک اوباما وغیرہ جیسے نہیں ہوں گے۔

ٹھیک ہے اب سوال یہ ہے کہ وہ ریاست کہاں سے آئے گی؟

وہ حکمران کہاں سے آئیں گے؟

جو لوگوں سے ان کی فاضل دولت لے کر اس کی مساویانہ تقسیم کر دے۔ کیا وہ آسمان سے نازل ہو گی؟ کیا وہ بزور تلوار اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کرے گی۔

قرآن تو آپس میں مشاورت کا حکم دیتا ہے۔ تو پھر یقیناً اس ریاست کے حکمران ان ہی لوگوں کے منتخب شدہ افراد پر ہی مشتمل ہوں گے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگ جو اپنی فاضل دولت کی وجہ سے ظلم و استبداد سے باز نہیں آرہے، جو دوسروں کے حقوق غضب کر رہے ہیں وہ ایسے لوگ منتخب کریں جو اِن سے ان کی فاضل دولت چھین لیں؟

یہ کیسے ممکن ہو گا کہ اس ریاست کے حکمران تو اتنے پارسا اور اللہ کے حکم پر چلنے والے ہوں گے کہ لوگوں سے ان کا فاضل مال لے کر دوسروں میں مساویانہ تقسیم کر دیں۔ لیکن ان کو منتخب کرنے والے لوگ وہ ہی ظالم، جابر، مستبد اور دین کے باغی ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دین ان چند حکمرانوں کی زندگی میں تو انقلاب لے آیا۔ لیکن انہیں منتخب کرنے والے لاکھوں لوگوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

دراصل یہ فریب نظر ہے۔ جب کسی عقیدہ و نظریہ کی بنیاد ہی مفروضوں پر مشتمل ہو تو اسے ثابت کرنے کے لیے اس ہی طرح ریت کے گھروندے بنانے پڑتے ہیں۔ دراصل یہ ایک بیمار سوچ ہے کہ اگر چھری سے کسی نے قتل کر دیا تو بس چھری پر پابندی لگا دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔

انسان کے جذبات ہی اس میں کچھ کر گزرنے کی سوچ پیدا کرتے ہیں۔ مسابقت کا جذبہ اس ساری کائنات کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہے۔ اگر انسان میں مسابقت کا جذبہ ہی ختم ہو جائے تو وہ مٹی کا ڈھیر بن کے رہ جاتا ہے۔
قرآن انسان کے جذبات کا احترام کرتا ہے۔ وہ صرف ان جذبات کو وحی کے تابع لانے کی بات کرتا ہے۔ وہ انسان کے ان جذبات کی مذمت کرتا ہے جو وحی کے خلاف ہوں۔ وہ خدا انسان کی توجہ بار بار کائنات پر مرکوز کرواتا ہے۔ وہ انسان کو اس کائنات میں غور و فکر کا حکم دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کائنات کی تسخیر کرے اس سے فائدہ حاصل کرے اور اپنے اس فائدے میں تمام بنی نوع انسان کو بھی شامل کرے۔ اس ہی کا نام انفاق ہے۔

ذرا غور فرمائیں اگر نیوٹن، آئن سٹائین اپنے اپنے تجربات کو عام نہ کرتے۔ موذی بیماریوں کا علاج دریافت کرنے والے سائنسدان اپنی تحقیق دنیا سے چھپا کر رکھ لیتے۔ وہ تمام سہولیات زندگی یہ بجلی، یہ سردیوں میں ہیٹر، گرمیوں میں ائیر کنڈیشن، یہ جہاز، یہ ٹی وی، یہ ساری سہولیات زندگی، ان میں ہمارا بحیثیت فرد، قوم اور امت کیا حصہ ہے؟
آج ساری دنیا ہماری انگلی کے ایک اشارے پر کھڑی ہے۔ انٹرنیٹ پر ہر طبقہ اور شعبے کا انسان اپنی ضرورت کی ہر شئے حاصل کر لیتا ہے۔ اگر اس کے موجد نے یہ سب کچھ صرف اپنے لیے یا اپنی قوم کے لیے محدود کر لیا ہوتا تو آج دنیا کہاں ہوتی۔ کیا یہ سب انفاق نہیں ہے؟
تو کیا ہم یہ کریں کہ ان سے ان کی یہ ساری محنت چھین لیں۔ اسے کسی گروہ یا ریاست کی ملکیت بنالیں یہ کہہ کر کہ جناب یہ سب اب آپ کا نہیں ہے، ریاست کی ملکیت ہے۔ انہیں اس جرم کی سزا دیں کہ تم نے اپنی محنت کے فوائد ہم لوگوں تک عام کیوں کیے؟

آیئے اب ہم اس آیت مبارکہ 2:219 کے آخری لفظ "قل العفو" کے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔ اس مقام پر میں دانستہ طور پر اس آیت مبارکہ کے تیسرے لفظ "انفاق" پر بات کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ کیونکہ "انفاق" ایک وسیع المعنی قرآنی اصطلاح ہے چنانچہ میں نے اسے سب سے آخر میں اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔

دوستو! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ عربی ایک فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ اس مقام پر میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ عربی زبان کا ایک لفظ ہے "ضرب" اس لفظ کے معنی "مارنا"، "مثال دینا"، "سفر کرنا"، "ٹکرانا"، "سمجھانا" وغیرہ ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ جب بھی قرآن کریم کی کسی ایسی آیت مبارکہ کا ترجمہ کرنا ہو، جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہو، مترجم کو بیان کئے جانے والے مضمون، اس کے سیاق وسباق اور قرآن کریم کی مجموعی تعلیم کو پیش نظر رکھ کر اس لفظ کا ترجمہ کرنا ہوگا۔ اگر مترجم اس بات کا دھیان نہیں کرے گا تو بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔

اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ عربی زبان کا ایک لفظ "آلاء" ہے۔ جس کے معنی نعمت، قدرت، کرشمہ وغیرہ ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم کی مشہور سورہ الرحمٰن میں بتکرار استعمال ہوا ہے۔ میں یہاں ایک دو آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں فرمایا

"اور جو شخص اپنے رب کے حضور (پیشی کے لئے) کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اُس کے لئے دو جنتیں ہیں، (46) پس تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، (47) جو دونوں (سرسبز و شاداب) گھنی شاخوں والی (جنتیں) ہیں، (48) پس تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، (49) ان دونوں میں دو چشمے بہہ رہے ہیں، (50) پس تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے" (ترجمہ: طاہر القادری صاحب)

اس ہی کے ساتھ یہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"مجرم لوگ اپنے چہروں کی سیاہی سے پہچان لئے جائیں گے پس انہیں پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ کر کھینچا جائے گا، (41) پس تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، (42) (اُن سے کہا جائے گا:) یہی ہے وہ دوزخ جسے مجرم لوگ جھٹلایا کرتے تھے، (43) وہ اُس (دوزخ) میں اور کھولتے گرم پانی میں گھومتے پھریں گے، (44) پس تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے،" (ترجمہ: جناب طاہر القادری صاحب)

ذرا غور فرمائیں۔ کیا صورتحال ہے۔ کھولتا ہوا پانی، جہنم کا عذاب، لوگوں کو گھسیٹنا، کیا یہ نعمتیں ہیں؟

وجہ کیا ہے کہ مترجم نے اس لفظ "آلاء" کے صرف ایک معنی کو ہی اختیار کیا اور مضمون کے سیاق وسباق پر غور کیے بغیر ہر اس جگہ جہاں یہ لفظ آیا اس کا ترجمہ نعمت کر دیا۔

اس کے مقابلے میں ان ہی آیات کا ترجمہ جناب مودودی صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

"اور ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو، دو باغ ہیں(46) اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ (47) ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور (48) اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟(49) دونوں باغوں میں دو چشمے رواں(50) اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟"

(ترجمہ: مودودی صاحب)

"مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا (41) اُس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟(42)(اُس وقت کہا جائے گا) یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے (43) اُسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں گے (44) پھر اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟" (ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

یہ ہی صورتحال آیت مبارکہ 2:219 میں بھی درپیش ہے۔ "العفو" کے معنی درگزر، معافی، متانت کے بھی ہیں تو اس کے معنی زائد از ضرورت کے بھی ہیں اور اس کے معنی بہترین شئے کے بھی ہیں (لغات القرآن، صفحہ 1178، از جناب غلام احمد پرویزؒ)۔ پورے قرآن میں یہ لفظ "العفو" عمومی طور پر، درگزر، معافی، کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ زائد از ضرورت کے معنی میں یہ لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ لیکن اگر ہم "انفاق" کے حوالے سے قرآن کریم کی مجموعی تعلیم کو دیکھیں تو اس مقام پر اس لفظ "العفو" کا ترجمہ زائد از ضرورت ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اس کا درست ترجمہ محبوب شئے، پسندیدہ شئے، بہترین شئے ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ" (3:92)

ہر گز نیکی میں کمال حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز سے کچھ خرچ کرو اور جو چیز تم خرچ کرو گے بے شک اللہ اسے جاننے والا ہے (ترجمہ: احمد علی)

دوسری جگہ فرمایا۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَلاَ تَيَمَّمُواْ الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيْهِ إِلاَّ أَن تُغْمِضُواْ فِيْهِ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ " (2:267)

اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے ستھری چیزیں خرچ کرو اور اس چیز میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہے اور اس میں سے ردی چیز کا ارادہ نہ کرو کہ اس کو خرچ کرو حالانکہ تم اسے کبھی نہ لو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور سمجھ لو کہ بے شک اللہ بے پرواہ تعریف کیا ہوا ہے (ترجمہ: احمد علی)

"لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ " (2:177)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے وہ دوست جن کا یہ اصرار ہے کہ لفظ "ماذا" کا معنی "کتنا دیں" ہو یا "کیا دیں" ہو، ایک ہی بات ہے لیکن وہ اس بات پر رضامند نہیں ہوتے کہ اپنے تراجم میں اس لفظ "ماذا" کا ترجمہ "کیا دیں" کر دیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس لفظ "ماذا" کا ترجمہ "کیا دیں" کرنے سے "العفو" کے معنی زائد از ضرورت رہ ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ

اس آیت مبارکہ 2:219 کا یہ مفہوم کہ "سوال کرتے ہیں کہ ہم کتنا انفاق کریں، کہہ دو جو زائد از ضرورت ہو سب کا سب" دلائل بالا سے باطل ثابت ہوتا ہے۔

سوشلزم کے ایک غیر فطری ناممکن العمل نعرے "کماؤ صلاحیت کے مطابق، خرچ کرو ضرورت کے مطابق" اور باقی سب حکومت کو دے دو کو قرآنی سند دینے کے لیے ہمارے سابقین نے غالباً غیر دانستہ طور پر اور ہمارے موجودہ احباب دانستہ طور پر اس آیت مبارکہ کا من مانا غیر حقیقی ترجمہ کر کے قرآن کریم کی تعلیم کو دانستہ ایک دوسرا رنگ دے رہے ہیں۔ جو قرآن کریم کی مجموعی تعلیم ہی نہیں ہے۔

یقیناً اللہ کریم ان لوگوں سے جن کے پاس رزق کی فراوانی ہے، اپنے ان بھائیوں کی مدد کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ بھوکے کی روٹی کا بندوبست کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن ایسا وہ انسان کے دل کی کامل رضامندی سے کرنا چاہتا ہے۔ بزور طاقت نہیں۔ وہ لوگوں سے ان کا مال چھین کر ان سے نیکی نہیں کروانا چاہتا۔ بلکہ وہ اپنے ماننے والوں کو ان کے مال کا مالک تسلیم کرتے ہوئے، رضاکارانہ طور پر انسانوں کی روٹی کے بندوبست کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ جب کہ سوشلزم یہ کام بزور طاقت کروانا چاہتا ہے۔ سوشلزم کے ان نظریات کو عملی طور پر نافذ کرنے کے سوال پر ہمارے یہ بزرگان اور ان کے پیروکار بھی مارکس کی طرح خاموش ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس مال ہی نہیں ہو گا تو پورے قرآن میں موجود ایسے الفاظ، مثلاً صدقات، خیرات، زکوٰۃ، انفاق، اموال الناس، جیسے الفاظ کا کیا مفہوم ہو گا۔

اس سوال کے جواب میں علامہ پرویزؒ یہ فرماتے ہیں۔ کہ یہ سارے احکامات اسلامی نظام کے عبوری دور کے ہیں۔ آگے جا کر، زکوٰۃ کے عنوان میں، میں نے اس بات کو دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دین کا ہر حکم، اس کے پیروکاروں پر پہلے دن سے نافذ العمل ہوتا ہے۔ کسی حکم پر عملدرآمد کے حوالے سے حکمت عملی کا تعین الگ بات ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ کچھ احکامات کسی مخصوص دور کے لیے ہیں، وہ ہی ناسخ و منسوخ والی بات ہے۔

جہاں تک صدقات، خیرات، زکوٰۃ، انفاق، اموال الناس، وغیرہ کے حوالے سے یہ موقف کہ ان کا تعلق اسلام کے عبوری دور سے ہے، بہت بڑی زیادتی ہے۔ بہت بڑی جرات ہے۔

اگر ہمارے محترم بزرگ، ایک مخصوص نظریہ کو ذہن سے نکال کر اس پر تفکر و تدبر کر لیتے، تو اس حقیقت کو پالیتے، کہ صدقات، خیرات، زکوۃ، انفاق، اموال الناس کے حوالے سے نازل شدہ سارے کے سارے احکامات، سورہ بقرہ، سورہ نساء، سورہ توبہ، سورہ مائدہ میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ ساری کی ساری سورتیں، مدنی ہیں۔ یہ وہ دور ہے کہ جب مدینہ منورہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہو چکی ہے ایک ریاست کے قیام کے بعد، کون سا عبوری دور رہ جاتا ہے؟؟؟ اگر ان سورتوں میں بیان شدہ احکامات کسی نام نہاد عبوری دور کے لیے ہیں، تو پھر صرف ان ہی معاملات میں کیوں ایسا کہا جائے، پھر تو جو بھی قانون ان سورتوں میں بیان ہوئے ہیں، سب کے سب کسی نام نہاد عبوری دور سے مشروط ہونے چاہیں۔

سوال یہ ہے کہ، اگر کسی کے پاس مال ہی نہیں ہو گا تو وہ تجارت کیسے کرے گا، جسے قرآن سود کے مقابل باقاعدہ ایک حلال نظام تسلیم کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ سوال کہ جب کوئی انسان اپنی ضرورت سے زائد مال رکھ نہیں سکتا تو وہ زیادہ محنت کر کے اس مال کو کمانے کی کوشش کیوں کرے گا؟

معاشرے میں سب افراد تو ہنر مند نہیں ہوتے۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کاروبار چلاتے ہیں، فیکٹریاں چلاتے ہیں۔ اب اگر یہ لوگ مال کے مالک ہی نہیں ہو سکتے اور وہ اپنا مال بیت المال میں جمع کروانے کے پابند ہیں تو پھر ان کی ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔ کیا یہ لوگ اپنا سارا مال و اسباب حکومت کے حوالے کرنے کے بعد اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے بیت المال کے سامنے بھیک منگوں کی طرح، لائن میں کھڑا ہو کر روزانہ روٹی حاصل کریں گے؟

پھر چند سالوں میں جب سارے کے سارے تاجر، فیکٹری مالکان اپنے اپنے مال بیت المال میں جمع کروا کے فارغ ہو چکے ہوں گے تو پھر کیا صورتحال ہو گی؟ حکومت ایسا کیا کرے گی کہ ان لوگوں کی روٹی کا مستقلاً بندوبست ہو۔ کیا اس طرح معاشرے میں صرف اور صرف بھیک منگوں ہی کا دور دورہ نہیں ہو جائے گا؟؟

معاشی مساوات کا مطلب تو یہ ہی ہو گا نہ کہ، یا تو سب لوگ کڑوروں پتی ہوں گے، یا لکھ پتی یا کنگلے۔ تو جب سب لوگ ایک ہی پوزیشن کے مالک ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تو کوئی سویپر کیوں کسی کی گندگی اٹھائے گا؟

کوئی مزدور شدید گرمیوں میں کیوں اینٹیں ڈھوئے گا؟

کوئی لوہار کیوں شدید جسمانی محنت کرے گا؟

ظاہر ہے کہ ہر آدمی آسان کام ہی منتخب کرے گا۔ کسی کو آخر کیا مجبوری ہو گی کہ وہ معاشرے کے زیادہ محنت طلب کام کرے؟ ہمارے ان محترم بڑوں کے پاس بھی اور آج آنکھیں بند کر کے ان بڑوں کی تقلید کرنے والے ہمارے ان ہم عصر دوستوں، جو خود کو بزعم خود قرآن کا پیروکار متعارف کرواتے ہیں، کے پاس بھی ہمارے ان سوالات کا کوئی مدلل جواب نہیں ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے یہ دوست، اپنے بڑوں کی اس نصیحت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ۔

" ہم دین میں سند نہیں ہیں۔ جو کچھ ہم نے اپنی فہم سے درست سمجھا پیش کر دیا۔ ممکن ہے ہم سے غلطی ہو گئی ہو۔ آپ لوگ اپنی فہم سے ہماری پیش کردہ معروضات کو بھی دیکھیں۔ اور پھر قرآن کریم کو بھی اپنی فہم سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہماری فہم سے متفق ہوں تو اسے درست مان کر اس عمل کریں۔ اور آپ کی فہم کچھ اور راستہ دکھائے تو اپنی فہم پر بھروسہ کریں۔ بس ایک بات حتمی ہے، کہ دین صرف کتاب اللہ میں ہے "

اپنے بڑوں کی اتنی عظیم الشان سچ اور حق پر مبنی اس نصیحت کے بعد بھی اگر ہم کتاب اللہ کو صرف اور صرف ان معزز اکابرین ہی کی نظر سے پڑھنا اور ان ہی کی بصیرت کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں تو اس پر سوائے افسوس کے کیا کیا جا سکتا ہے۔

آیئے ہم قرآن کریم سے موضوع زیر بحث "انفاق" کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنی معروضات پیش کرنے سے پہلے میں چند تمہیدی حقائق پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جنہیں مد نظر رکھے بغیر ہم قرآن کریم کی حقیقی تعلیم کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

1۔ یہ کہ۔۔۔۔ قرآن اللہ کریم کا کلام ہے۔

2۔ یہ کہ۔۔۔۔ قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔

3۔ یہ کہ۔۔۔۔ یہ کوئی لکھی لکھائی کتاب نہیں تھی جو یکبارگی نازل کر دی گئی ہو۔

4۔ یہ کہ ۔۔۔۔ یہ خطبات کا وہ مجموعہ ہے، جو حسب ضرورت تقریباً 23 سالوں میں، اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے۔

5۔ یہ کہ ۔۔۔۔ قرآن کریم میں ہر لفظ اٹل ہے۔نہ کوئی لفظ زائد استعمال ہوا ہے اور نہ ہی کم اور نہ ہی بلا ضرورت۔

6۔ یہ کہ ۔۔۔۔ قرآن کریم کا کوئی بھی لفظ عربی کے کسی دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کا ہر لفظ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد معنی اور مفہوم لیے ہوئے ہے۔

7۔ یہ کہ ۔۔۔۔ قرآن کریم قیامت تک کے انسان کی راہنمائی کی کتاب ہے۔اور ظاہر ہے کہ ہر دور کے اپنے اپنے حالات اور ان کے تقاضے ہوں گے۔یہ ہی وجہ ہے کہ اللہ کریم نے اس کتاب عظیم میں بہت کم معاملات زندگی کی جزیات خود طے کی ہیں۔اور اکثر کے حوالے سے بنیادی اصول بیان فرما کر ان کی جزیات کے تعین کے لیے اس دور کے انسانوں کو باہمی مشاورت سے لائحہ عمل طے کرنے کا اختیار دیا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کا کوئی بھی حکم یا ہدایت نہ تو کسی عبوری دور سے مخصوص ہے۔اور نہ ہی منسوخ ہے۔البتہ مخصوص حالات کے تناظر میں جہاں جہاں کسی استشناء یا رخصت کی ضرورت محسوس کی گئی اسے بھی بیان کر دیا گیا۔

8۔ یہ کہ یہ کتاب اللہ ہے۔ہر لحاظ سے مکمل، مفصل اور ہر قسم کے تضادات سے پاک۔چنانچہ کسی بھی آیت کا کوئی ایسا ترجمہ یا مفہوم جو اس میں موجود کسی آیت یا اس کی بنیادی تعلیم سے متصادم ہو۔درست نہیں ہو گا۔چنانچہ قرآن کریم کی آیات کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم کی مجموعی تعلیم اس کا اسلوب بیان، لازماً ہمارے پیش نظر ہونا چاہیے۔

دوستو! معاشی مسئلہ کے حوالے سے قرآن کریم میں چند مخصوص اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔بد قسمتی سے ان اصطلاحات کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ کر انہیں ایک ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اور اس وجہ سے بہت ساری پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے انسانی معاشی مسئلے کے حل کے لیے، صدقات، خیرات، زکوۃ، اور انفاق کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ تمام کے تمام الفاظ اپنی اپنی جگہ ایک پورے نظام اور تاریخ کو بیان کرتے ہیں۔ یہ الفاظ ہرگز ہرگز ایک مفہوم کے حامل نہیں ہیں۔ نہ زکوۃ، صدقات کہلا سکتی ہے اور نہ ہی، انفاق۔

# انفاق

دوستو! عربی ایک وسیع اور فصیح زبان ہے۔ دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خالق کائنات کا اس زبان کو انسانوں سے اپنے آخری خطاب کے لیے منتخب کرنا ہے اور اس کریم نے اس حقیقت کی طرف بار بار ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔

عربی زبان میں ہر لفظ کا ایک بنیادی مادہ ہوتا، جو عموماً سہ حرفی اور کبھی کبھی چار حرفی ہوتا ہے۔ اور ہر مادے سے بننے والے لفظ میں اس مادے کی بنیادی خصوصیت موجود ہوتی ہے۔ انفاق، کا مادہ، نفق ہے۔ جس کے معنی سرنگ کے ہوتے ہیں، جو دونوں جانب سے کھلی ہوئی ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ " (6:35)

تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہٰذا نادان مت بنو۔ (ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

چونکہ سرنگ دونوں جانب سے کھلی ہوتی ہے۔ اس جہت سے انفاق کا معنی "کھلا رکھنا" ہے۔ قرآن کریم میں جابجا، اللہ کریم نے اپنے مومن بندوں کو انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس ہی کے ساتھ یہ لفظ، بیویوں کے حق مہر،

اپنے اہل و عیال کی پرورش، ماں باپ اور ضرورت مندوں کی امداد اور اپنی مطلقہ حاملہ بیوی کے نان نفقہ، کسان کے زمین میں بیج بونے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

## عورتوں کا حق مہر

ارشاد باری تعالیٰ ہے

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ " (60:10)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال ان کے کافر شوہروں نے جو مہر اُن کو دیے تھے وہ انہیں پھیر دو اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ تم اُن کے مہر اُن کو ادا کر دو اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ (ترجمہ: ابو الاعلیٰ مودودی)

" وَإِن فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ " (60:11)

اور اگر کوئی عورت تمہاری عورتوں میں سے کفار کے پاس نکل گئی ہے پھر تمہاری باری آجائے تو ان مسلمانوں کو دے دو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں جتنا کہ انہوں نے دیا تھا اور اس اللہ سے ڈرو کہ جس پر تم ایمان لائے ہو (ترجمہ: مودودی صاحب)

## اهل وعیال کی پرورش

"الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ ۚ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا " (4:34)

مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس واسطے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے اور اس واسطے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں پھر جو عورتیں نیک ہیں وہ تابعدار ہیں مردوں کے پیٹھ پیچھے اللہ کی نگرانی میں (ان کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا خطرہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور سونے میں جدا کر دو اور مارو پھر اگر تمہارا کہاماں جائیں تو ان پر الزام لگانے کے لیے بہانے مت تلاش کرو بے شک اللہ سب سے اوپر بڑا ہے

(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

## ماں باپ اور ضرورت مندوں کی امداد

" يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ " (2:215)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی) ماں باپ اور قریب کے رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے خدا اس کو جانتا ہے

(ترجمہ: جناب فتح محمد جالندہری صاحب)

## مطلقہ بیوی کا نان نفقہ

"أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ " (65:6)

طلاق دی ہوئی عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم اپنے مقدور کے موافق رہتے ہو اور انہیں ایذا نہ دو انہیں تنگ کرنے کے لیے اور اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں نان ونفقہ دو جب تک وہ وضع حمل کریں پس اگر پلائیں دودھ تمہارے لیے تو دو ان کو ان کی اجرت دو اور آپس میں دستور کے مطابق مشورہ کر لو اور اگر تم آپس میں تنگی کرو تو اس کے لیے دوسری عورت دودھ پلائے گی۔(ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

"لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا " (65:7)

مقدور والا اپنے مقدور کے موافق خرچ کرے اور اگر تنگ دست ہو تو جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے اس میں سے خرچ کرے اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی قدر جو اسے دے رکھا ہے عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی کر دے گا۔ ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

## کسان کے بیج بونے کے لیے

" وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا " (18:42)

اور اس کا پھل سمیٹ لیا گیا پھر وہ اپنے ہاتھ ہی ملتارہ گیا اس پر جو اس نے اس باغ میں خرچ کیا تھا اور وہ اپنی چھتریوں پر گرا پڑا تھا اور کہا کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

## انفاق فی سبیل اللّٰہ

اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں، ان الفاظ "فی سبیل اللہ" پر غور کرنا ہوگا۔ عربی زبان میں، اس لفظ "سبیل" کا معنی "راستہ" ہے۔ لیکن جب قرآن اسے اپنی مخصوص اصطلاح میں "فی سبیل اللہ" کہتا ہے تو اس کے معنی، ہر وہ کوشش ہے جو دین کے تمکن کے لیے کی جائے۔ ظاہر ہے کہ دین کے تمکن کے لیے، جان و مال دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں، اللہ کی راہ میں جان دینے اور لینے کو، بھی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ دین کے تمکن کے لیے ہجرت کو بھی "سبیل اللہ" کہا گیا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں جان دینے اور لینے والوں کی مالی امداد کو بھی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مد کو "فی سبیل اللہ" نہیں کہا گیا۔

یوں تو اس ضمن میں قرآن کریم کی بہت ساری آیات مبارکہ موجود ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے سب کا درج کرنا ممکن نہیں۔ چند ایک مثالیں دوں گا۔ فرمایا

"وَلاَ تَقُولُواْ لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبيلِ اللّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاء وَلَكِن لاَّ تَشْعُرُونَ" (2:154)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مرا ہوا نہ کہا کرو بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔

(ترجمہ: احمد علی صاحب)

"وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ" (2:190)

اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

"قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ" (3:13)

تمہارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں کا گزر چکا ہے جو آپس میں ملیں ایک فوج اللہ کی راہ میں لڑتی ہے اور دوسری فوج کافروں کی ہے وہ کافر مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے آنکھوں کے دیکھنے سے اور االلہ جسے چاہے اپنی مدد سے قوت دیتا ہے اس واقعہ میں دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ (ترجمہ جناب احمد علی صاحب)

" الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا " (4:76)

جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں سو تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے۔(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

"لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا " (4:95)

مسلمانوں میں سے جو لوگ کسی عذر کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں دونوں برابر نہیں ہیں اللہ نے بیٹھنے والوں پر جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑھا دیا ہے اگرچہ ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھنے والوں سے اجر عظیم میں زیادہ کیا ہے۔

(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

" وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا " (4:100)

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے اس کے عوض جگہ بہت اور کشائش پائے گا اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے پھر اس کو موت پالے تو اللہ کے ہاں اس کا ثواب ہو چکا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

" إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ " (9:111)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکالیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (ترجمہ: جناب مودودی صاحب)

قرآن کریم میں کسی بھی مقام پر حکومت کے اخراجات، محروم لوگوں کی مالی امداد کو فی سبیل اللہ نہیں کہا گیا۔ اور نہ ہی اپنا سارے کا سارا مال ریاست یا بیت المال کے حوالے کرنے کا کوئی حکم ہے۔ حکم ربی کے مطابق، مومنین کو، انفاق کا حکم ہے۔ یعنی اپنا مال ان مدات میں ہر وقت کھلا رکھنے کا حکم ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ کھلا رکھنے سے کیا مراد ہے۔ کیا اس کا معنی یہ ہے کہ مومن اپنا سارا مال و اسباب کسی چوراہے پر رکھ دے گا کہ جسے ضرورت ہے آ کے لے جائے۔ یا وہ کچھ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کا مال معاشرے میں ایسا تغیر پیدا کرے جس کے نتیجہ میں معاشرے میں اتنی خوشحال آ جائے کہ اس معاشرے کا ہر فرد اپنی ضرورت کا انتظام اپنے زور بازو سے خود کر لے۔

بات زائد از ضرورت کی تو ہے ہی نہیں۔ انسان اپنی محنت سے جو کچھ بھی حاصل کرے گا وہ اس کا مالک و مختار ہے۔ البتہ دوسروں کے ساتھ ظلم و استبداد سے حاصل کی ہوئی ہر شئے، ربوٰ ہے، حرام ہے۔ ذرا اس آیت مبارکہ پر غور فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ " (2:274)

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

"الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ "(2:275)

مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں، اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے، جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے"، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آجائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اِس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

" يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ " (2:276)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ " (2:277)

ہاں، جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اُن کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ " (2:278)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

" فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ " (2:279)

لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

(ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

دوستو! آیات بالا اس سارے معاملے پر حرف آخر ہیں۔ غور فرمائیں کس طرح ان چند آیات میں رب کریم نے تجارت، ربوٰ (ربا، سود)، انفاق، صدقات اور زائد از ضرورت مال کو واضح کر دیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں دنیا کی وہ کون سی تجارت ہے جو بغیر مال کے ممکن ہے؟ جسے اللہ کریم حلال فرما رہے ہیں۔

آیت مبارکہ 2:279 پر بہت زیادہ تفکر فرمائیں اور اس تفکر سے پہلے اس بات کو بھی ذہن نشین فرمالیں کہ یہ سورۃ بقرہ کی آیات ہیں۔ سورۃ بقرہ مدنی سورہ ہے، یہ اس دور میں نازل ہوئی جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست معرض وجود میں آچکی تھی۔ اس سورہ مبارکہ میں اسلامی ریاست اور اس کے باسیوں کو مستقل اور ابدی احکامات و راہنمائی عطا فرمادی گئی ہے۔ اس سورہ مبارکہ کی کسی آیت مبارکہ کو ہمارا کوئی دوست کسی نام نہاد عبوری دور کا حکم قرار دے کر راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔

غور فرمائیں کیا کہہ رہا ہے قرآن اس آیت مبارکہ 2:279 میں۔ کہا کہ اگر تم نے ربو کو نہ چھوڑا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم ربوٰ سے تائب ہو جاؤ تو۔۔ اپنے اصل سرمائے کے حق دار ہو۔۔ اس کے مالک ہو۔

کیونکہ جس طرح کسی سے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر کچھ مال حاصل کر لینا ظلم ہے، اس ہی طرح یہ بھی ظلم ہو گا، اگر تمہارا اصل سرمایہ تمہیں نہ ملے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہو۔ اللہ اکبر۔

دوستو! مجھے بتائیں وہ سرمایہ جو اس دور میں کسی نے سود کے نظریہ سے لگایا ہوا تھا کیا وہ اس شخص کا زائد از ضرورت مال نہیں تھا؟ تو اگر آیت مبارک 2:219 جو اس آیت مبارکہ 2:279 سے 60 آیات قبل کی آیت ہے، اگر اس کا مفہوم یہ ہی ہے کہ کوئی انسان زائد از ضرورت مال کا مالک ہو ہی نہیں سکتا تو کیا معاذ اللہ وہ رب کریم اپنے دیئے ہوئے پہلے حکم کی خلاف ورزی کا کہہ رہا ہے۔

جب آیت مبارکہ 2:219 کی رو سے زائد از ضرورت مال ریاست کی ملکیت ہے تو کیوں اس آیت مبارکہ 2:279 میں اس "راس المال" کو ضبط کرنے کا حکم نہیں دیا جارہا؟ کیوں اس آیت مبارکہ میں اس "راس المال" کو اس انسان کی ملکیت ہی قرار دیا جارہا ہے؟ کیوں اس "راس المال" کے نہ ملنے کو ظلم کہا جارہا ہے؟ تفکرو۔

دلائل بالا سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ نہ تو اس لفظ "ماذا" کا معنی کتنا ہوتا ہے۔ نہ ہی اس لفظ "انفاق" کا معنی صرف اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس لفظ "العفو" کا معنی صرف زائد از ضرورت ہوتا ہے۔ ہمارے سابقین نے اپنے وقت کے رجحانات سے متاثر ہو کر سوشلزم کے بظاہر دلفریب، مگر غیر فطری نعرے کو قرآنی سند عطا کرنے کے لیے دانستہ یا غیر دانستہ غلطی کی۔ اور اس ضمن میں قرآن کریم کی تعلیم کو مشرف بہ سوشلزم کرنے کا تاریخی سہو کیا۔

اللہ کریم ان کے درجات کو بلند کرے اور انکی کوتاہیوں سے درگذر فرمائے۔ اور ہمارے دور کے دوستوں کو دلائل بالا کی روشنی میں اس فکر اور نظریہ پر نظر ثانی کی توفیق عطا فرمائے۔ چنانچہ میری فہم کے مطابق اس آیت مبارکہ 2:219 کے دوسرے حصے کا درست مفہوم اس طرح ہے۔

"یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا انفاق کریں۔ کہہ دو، وہ جو تمہیں اپنے لئے پسند ہو وہ جو تمہارے پاس سب سے بہترین ہو"۔

خواہ وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو۔ خواہ وہ زمین سے نکلنے والی پیداوار ہو۔ ہر وہ شئے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ ملاحظہ فرمائیں۔

" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ " (2:267)

اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے، خرچ کیا کرو اور اس میں سے گندے مال کو، خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کرلو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بے نیاز لائق ہر حمد ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

یادرکھو تمہارے اعمال ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ فرمایا

" الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ " (2:274)

جو لوگ اپنے مال، رات اوردن چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے اپنے رب کے ہاں ثواب ہے ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(ترجمہ: احمد علی)

اور ایسا نہیں ہے کہ تمہاری یہ قربانیاں ضائع چلی جائیں گی۔ بلکہ جو کچھ تم انفاق کروگے، اللہ اس کی جگہ تمہیں اور دے دے گا۔ فرمایا۔

" قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ "(34:39)

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ان سے کہو، "میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے جو کچھ تم خرچ کردیتے ہو اُس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

غور فرمائیں اس آیت مبارکہ پر۔ کہا جو کچھ تم "انفاق" کروگے، اللہ تمہیں اور عطا فرمائے گا۔ اس مقام پر اس حقیقت کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ اللہ کریم یہ الفاظ حضور اکرم ﷺ کی زبانی کہلوا رہے ہیں۔ حکم دیا جارہا ہے محمد ﷺ کو کہ اپنے پیروکاروں سے کہہ دو۔ اور ہمارے ان دوستوں کے بقول حضور ﷺ کا مطلب مرکز ملت، مرکزی اتھارٹی ہے۔ یعنی اس مرکز ملت کی طرف سے یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ اے میرے پیروکارو، اگر تم انفاق کروگے، تو تمہارا رب تمہیں اور عطا فرمائے گا۔ یعنی مرکز ملت، ریاست خود اس بات کا اقرار کررہی ہے کہ یہ انفاق ریاست کا نہیں، بلکہ مومنین کا انفرادی فعل ہے۔ جو اپنی رضا سے کرے گا۔ مجبور ہو کر نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح زائد از ضرورت مال ختم کیسے ہوگا؟ وہ تو کہہ رہا ہے کہ تم انفاق کیے جاؤ ہم تمہیں اور دیں گے۔ تو اس طرح تو کبھی بھی زائد از ضرورت مال ختم نہیں ہوگا۔ تو کیا معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، وہ رب کائنات ہم سے کھیل رہا ہے؟

ایک طرف وہ کہے کہ زائد از ضرورت مال رکھ نہیں سکتے۔ اور جب کوئی وہ زائد از ضرورت مال انفاق کر دے، تو اسے اتنا ہی بلکہ اس زیادہ اور دے دے۔ غور فرمائیں کتنا بڑا اتہام ہے اس رب کائنات پر؟

وہ تو پہلے ہی واضح فرمارہاہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم تم سے سارے مال کو انفاق کرنے کا کہہ رہے ہیں بلکہ تمہیں چاہیے کہ انفاق میں بھی درمیانہ روی اختیار کرو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

" وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا" (25:67)

جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔(ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

بہت غور طلب آیت ہے۔ سوچنے کا مقام ہے۔ ایک طرف یہ دعویٰ کہ زائد از ضرورت جو بھی ہے، سارے کا سارا انفاق کر دو۔ تم فاضل مال کے مالک ہی نہیں ہو سکتے۔ سب کا سب کسی گروہ کے حوالے کر دو۔ اور دوسری طرف یہ ہدایت کہ "انفاق" میں بھی اعتدال کرو نہ اسراف اور نہ بخل۔ غور فرمائیں کیا کہہ رہا ہے قرآن۔

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کیا 2:219 کے مروجہ مفہوم کے ساتھ، یہ دونوں آیات مبارکہ (2:219 اور 25:67) باہم متصادم نہیں ہیں؟

مومنین کو انفاق کا حکم ہے کیونکہ یہ عمل خود رب کائنات خود کرتا ہے۔ اور مومن کو بھی علیٰ حد بشریت اپنے اندر اس صفت خداوندی کو پیدا کرنا ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ" (5:64)

اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے انہیں کے ہاتھ بند ہوں اور انہیں اس کہنے پر لعنت ہے بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے خرچ کرتا ہے۔(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

میرے خیال سے قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ موضوع زیر بحث پر حرف آخر ہے۔ غور فرمائیں انفاق وہ بھی اللہ کریم کے ہاتھوں۔ سوچیں اللہ کس طرح انفاق کرتا ہے؟؟ وہ کون سی کرنسی اپنے بندوں کو دے رہا ہے؟؟

بات تو بہت سادہ سی ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر شئے وہ ہمیں عطا فرماتا ہے کھانا، پینا، عقل سمجھ، صلاحیت، دیکھنا، سننا، یعنی ہر نعمت جو انسان کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ علیٰ حد بشریت یہ ہی عمل ہم نے بھی کرنا ہے۔ اللہ کریم نے ہمیں جن نعمتوں سے نوازا ہے ان نعمتوں سے خود بھی فائدہ حاصل کریں اور دوسروں کو مستفید کریں۔ جسے روٹی کی ضرورت ہے اسے روٹی مہیا کر دیں۔ جسے گھر کی ضرورت ہے اسے گھر مہیا کر دیں۔ جسے علاج کی ضرورت ہو اسے علاج مہیا کر دیں۔ جسے علم کی ضرورت ہو، اسے علم مہیا کر دیں۔ ہر وہ عمل جو وہ رب کرتا ہے، اپنی حدود میں ہم بھی کریں۔ لیکن یہ سب برضا و رغبت ہو گا۔ کوئی فرد، گروہ، حکومت، ریاست ہمیں اس پر مجبور نہیں کر سکتی۔

## کفار کا انفاق

اللہ اور اس کے خالص بندے دین خداوندی کے تمکن اور تمام بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے انفاق کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ انفاق صرف مومنین تک مخصوص ہے بلکہ ان کے مقابلے میں کفار بھی اس دین خداوندی کو ناکام بنانے کے لیے انفاق کرتے ہیں۔ فرمایا

" إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ " (8:36)

بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے روکیں سو ابھی اور بھی خرچ کریں گے پھر وہ ان کے لیے حسرت ہو گا پھر مغلوب کیے جائیں گے اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

(ترجمہ: جناب احمد علی صاحب)

دوستو! "انفاق" ایک وسیع المعانی و مفہوم کا حامل لفظ ہے۔ یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اللہ کریم نے اپنے بندوں کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازا۔ اس کے بعد وہ اپنے بندوں سے تقاضا کرتا ہے کہ تم اپنی اپنی صلاحیتوں

کے مطابق اس کائنات کو تسخیر کرو۔ اس سے فوائد حاصل کرو اور اپنی محنت کے ان محاصل کو منفعت عامہ، تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے، عام کر دو۔ اس پر روک لگا کر نہیں بیٹھ جاؤ۔ اپنی محنت کے ماحاصل کو منجمد نہ کر دو۔ اسے معاشرے میں اس طرح گردش دیتے رہو جس طرح جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ تاکہ ساری انسانیت کا جسم گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جائے۔ لیکن ایسا وہ ڈنڈے کے زور پر نہیں کروانا چاہتا۔ نہ ہی کسی سے اس کی محنت کا ما حاصل چھین کر کروانا چاہتا ہے۔ وہ تو اس مال کو انسان کی آزمائش قرار دیتا ہے۔

" وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ "(8:28)

اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے اور بے شک اللہ کہ ہاں بڑا اجر ہے۔

(ترجمہ: احمد علی)

اب جب معاشرے میں کسی کے پاس یہ اشیاء ہوں ہی نہیں تو پھر کیسی آزمائش، اور کیسا امتحان۔ اور جب وہ فرماتا ہے کہ

" وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ "

(2:155)

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

اب میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک ایسا معاشرہ ہو، جہاں کسی کے پاس کوئی مال، جائیداد، باغات ہی نہ ہوں تو پھر وہ رب کریم کس شئے سے ہمیں گردشیں دے گا تاکہ ہم اپنی نشو و نما کو جانچ سکیں۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

# سرمایہ دار

اگر ہم اپنی روز مرہ کی گفتگو پر غور کریں اور معاش کے حوالے سے ہونے والے مکالموں اور مباحثوں کو دیکھیں تو یہ اصطلاح "سرمایہ دار" ایک گالی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ ہماری بد نصیبی ہی کہلائی جا سکتی ہے کہ ہم بہت ساری باتیں ایسی بھی کرتے چلے جاتے ہیں، جن پر کبھی غور ہی نہیں کیا جاتا۔

عام فہم الفاظ میں یہ لفظ سرمایہ دار بھی اس ہی زمرے آتا ہے جیسے کرایہ دار، چوکیدار، ایماندار وغیرہ ہیں۔ اس ہی سے اس لفظ "سرمایہ دار" کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ اصولی طور پر معاشرے کے خوشحال طبقے کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی جس کے پاس سرمایہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ کوئی شئے اپنے آپ میں بری ہوتی ہے یا اس کا استعمال اور اس کے حصول کے ذرائع؟ کیا مال و دولت، کشائش رزق اپنے آپ میں ایک قابل نفرت شئے ہے؟ کیا مال و دولت کا حصول از روئے قرآن ممنوع ہے؟ کیا ہر وہ شخص جس کے پاس اللہ کے دئے ہوئے رزق کی فراوانی ہو، قابل نفرت ہے؟ کیا ہر وہ شخص جس کے پاس مال و دولت کی فراونی ہو، وہ لازماً ظالم و جابر ہو گا؟ کیا کوئی انسان اپنی محنت کے صلے میں ان نعمائے زندگی کا مالک نہیں بن سکتا؟

قرآن کریم اس سوچ کو مسترد کرتا ہے۔ وہ رزق کی تنگی کو عذاب خداوندی کہتا ہے۔ وہ ایمان اور عمل صالحہ کا لازمی نتیجہ، تمکن ارض اور رزق کی فراوانی کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ " (5:66)

کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں ایسا کرتے تو اِن کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا اگرچہ اِن میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بد عمل ہے۔ (ترجمہ: ابو الاعلی مودودی)

مزید فرمایا۔

"فَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ" (22:50)

پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزّت کی روزی (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

قرآن ایمان اور عمل صالحہ کا لازمی نتیجہ زمین میں حکمرانی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا

" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ " (24:55)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم وپائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔ (ترجمہ: فتح محمد جالندھری)

اس کے مقابلے میں وہ غربت، افلاس اور تنگدستی کو عذاب الٰہی کہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

"وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ" (20:124)

اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لئے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے، (ترجمہ: طاہر القادری صاحب)

" وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ " (16:112)

اور اللہ نے ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جو (بڑے) امن اور اطمینان سے (آباد) تھی اس کا رزق اس کے (مکینوں کے) پاس ہر طرف سے بڑی وسعت و فراغت کے ساتھ آتا تھا پھر اس بستی (والوں) نے اللہ کی نعمتوں کی

ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا لباس پہنا دیا ان اعمال کے سبب سے جو وہ کرتے تھے،۔(ترجمہ: طاہر القادری صاحب)

قرآن اپنے متبعین کو تو دعا ہی یہ سکھاتا ہے۔

"وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ☆ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ" (2:201،202)

اور انہی میں سے ایسے بھی ہیں جو عرض کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی سے نواز اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ،(201) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کی (نیک) کمائی میں سے حصہ ہے، اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے،۔(ترجمہ: طاہر القادری صاحب)

ایمان اور عمل صالحہ کا لازمی نتیجہ دنیا کی خوشگواریاں، رزق کی فراوانی اور جنت ہے۔ مومن کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ کسی وقتی حادثہ کے نتیجہ میں، کوئی مشکل، پریشانی یا تنگی رزق اور بات ہے۔ لیکن مستقل ذلت ، افلاس اور محرومیاں اللہ کا عذاب ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کو دوسروں کے کھاتے میں ڈالنے کی بجائے اپنا احتساب کریں۔

سرمایہ دار، سرمایہ دار کی رٹ لگا کر دوسروں کو گالی دے کر لوگوں سے ان کا مال بزور طاقت چھیننے کی ترغیبات دے کر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کوتاہیوں کا ازالہ کرنا ہوگا، جن کی وجہ سے غربت اور افلاس آتی ہے۔ لوگوں کا مال چھین کر نہیں، بلکہ قانون خداوندی کے تحت، زیادہ محنت کرکے، اپنے پیدا کرنے والے کی اطاعت کرکے، اس کے حکم پر حرف بہ حرف عمل کرکے، غربت کے اندھیروں کو فراوانی رزق کے اجالوں میں بدلنا ہوگا۔

# معاشی مساوات

کائنات کی وسعتوں اور اس میں بسنے والی مخلوق پر غور کیجئے۔ فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں پر تفکر کیجئے۔ زیرزمین بسنے والے جانداروں کو توجہ سے دیکھیئے۔ سمندروں کی تہوں میں موجود مخلوق پر تدبر کیجئے۔ اور پھر زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کو بار بار دیکھیئے۔ ایک بار نہیں کئی بار دیکھیں۔ ان سب میں آپ کو ایک قدر مشترک نظر آئے گی۔ وہ یہ کہ ان تمام کے خالق نے، کسی ایک کو بھی دوسرے جیسا نہیں بنایا۔ مخلوق کا ہر ذرہ، اپنی اپنی جگہ ایک منفرد، جداگانہ حیثیت کا مالک ہے۔

خلاء کی وسعتوں میں مصروف عمل ہماری اس کہکشاں میں موجود لاتعداد اجرام فلکی، ایک خاص ترتیب کے ساتھ، سورج کے گرد مسلسل گردش میں مصروف ہیں۔ اس نہج سے سورج اس کہکشاں کا بادشاہ ہے۔ فضاؤں میں موجود لاتعداد پرندے، اور ان کا حکمران عقاب، سمندروں کی تہوں میں موجود لاتعداد آبی مخلوق اور ان کا شہنشاہ مگرمچھ۔ جنگلوں میں موجود لاتعداد جانور اور ان کا حکمران شیر، زیرزمین انواع اقسام کے کیڑے مکوڑے اور ان کے حکمران اژدھے۔ غور فرمائیں کیا یہ ہی ہمارا مشاہدہ اور ایک ایسا سچ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لیے کسی مذہب اور کسی فلسفے کی چنداں ضرورت نہیں؟

آخر کیا وجہ ہے، کہ خلاؤں میں سورج، سمندروں میں مگرمچھ، فضاؤں میں عقاب اور جنگلوں میں شیر اور زیرزمین اژدہے۔ حکمران ہیں؟

اس کا سادہ جواب ہے۔ "طاقت"

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج کی بے پناہ کشش، خلاء میں موجود تمام اجرام فلکی کو ایک مخصوص مدار میں ایک خاص ترکیب اور رفتار سے چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ سورج کی اس طاقت میں اگر کبھی، چند ثانیوں کے لیے تعطل آجائے تو اس ساری کائنات کا نظام ہی ختم ہو جائے۔

شیر، عقاب، مگرمچھ، اژدہے کی اپنی ہم عصر مخلوق کے مقابلے میں بے پناہ طاقت، انھیں حکمرانی کا حق دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انھیں یہ طاقت کس نے دی؟ کیا ان حکمرانوں کی طاقت ان کی اپنی پیدا کردہ ہے؟ کیا یہ اپنی مرضی سے اپنی اپنی ہم عصر مخلوق کے بادشاہ بن گئے ہیں؟ کیا ان حکمرانوں کی رعایا اپنی محبت کی وجہ سے انھیں اپنا حکمران تسلیم کرتی ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ ہر مخلوق کو اس کے خالق نے جیسا چاہا بنا دیا۔ جنگل میں دھاڑتے ہوئے شیر کے مقابلے میں اس خالق کائنات نے ہرن کو خوبصورتی، چیتے کو پھرتی، اور لومڑی کو ذہانت سے نوازہ۔ اس ہی طرح اس خالق ومالک نے، اپنی مخلوق میں سے ہر ایک کو، اپنی اپنی جگہ ایک منفرد شباہت اور صلاحیتوں کا مالک بنایا۔ کیونکہ یہ ساری مخلوق، مجبور محض ہے۔ یہ اپنی مرضی و منشاء سے کوئی فیصلہ کرنے پر قادر ہی نہیں اور اپنے خالق کی طے کی ہوئی تقدیر کے تابع ہے۔ اور اس خالق نے کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا۔

اب ہم انسانوں کی دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں، کوئی لحیم شحیم جسم کا مالک ہے۔ تو کوئی کمزور۔ کوئی طویل قامت ہے۔ تو کوئی پستہ قد۔ کوئی اتنا عاقل و فہیم کہ کائنات کے راز اس کے آگے بے معنی ہو کر رہ گئے۔ تو کوئی اتنا کند ذہن کہ ساری عمر کولھو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں گردش کرتا رہا۔ کوئی حسن و جمال کی اس معراج پر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگیں۔ تو کوئی اتنا بد صورت کہ وہ آئینے سے ہی نفرت کرنے لگے۔

یہ ہی نظام کائنات ہے۔ اور اس علیم و خبیر نے اپنی بصیرت کے مطابق، جو سب سے بہتر تھا، وہ کیا۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر سطحی نظر سے دیکھیں، تو کیا یہ بات ظلم میں شمار نہ ہو گی، کہ ایک طرف وہ لوگ جن کے حسن جمال کو دیکھنے کے لیے لوگ قطاروں میں کھڑے ہوں۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ کہ جنھیں اندھیرے میں دیکھ کر خوف طاری ہو جائے۔

ایک طرف نیوٹن، آئن اسٹائن، جیسے فہم و فراست کے مالک لوگ۔ تو دوسری طرف ایک وقت میں دو کام بھی نہ کر سکنے والے لوگ۔

تو کیا ہم یہ مان لیں کہ اس خالق کائنات نے اپنی مخلوق کے ساتھ، ان کی تخلیق کے وقت سے ہی ظلم کی ابتداء کر دی تھی؟؟

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، کیا وہ مالک کون و مکاں، رحیم و کریم، بھی ظلم کا مرتکب ہوا ہے؟

دوستو۔

وہ خدا جو ہمیں اس کائنات کے عظیم الشان نظام پر بار بار غور فکر کی دعوت عام دیتا ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں کسی نقص کی نشاندہی کا چیلنج دیتا ہے۔ کیا کہتا ہے۔ کہا

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۖ مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ (٦٧:٣)

جس نے سات (یا متعدّد) آسمانی کرّے باہمی مطابقت کے ساتھ (طبق در طبق) پیدا فرمائے، تم (خدائے) رحمان کے نظامِ تخلیق میں کوئی بے ضابطگی اور عدمِ تناسب نہیں دیکھو گے، سو تم نگاہِ (غور و فکر) پھیر کر دیکھو، کیا تم اس (تخلیق) میں کوئی شگاف یا خلل (یعنی شکستگی یا اِنقطاع) دیکھتے ہو۔ (طاہر القادری)

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (٦٧:٤)

تم پھر نگاہِ (تحقیق) کو بار بار (مختلف زاویوں اور سائنسی طریقوں سے) پھیر کر دیکھو، (ہر بار) نظر تمہاری طرف تھک کر پلٹ آئے گی اور وہ (کوئی بھی نقص تلاش کرنے میں) ناکام ہو گی۔ (طاہر القادری)

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ (٣٢:٧)

جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی (ابوالاعلی مودودی)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵:۴)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے، (طاہر القادری)

یہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی تخلیق میں کہیں جھول نہیں۔ کہیں کجی نہیں۔ جو کچھ بھی اس نے تخلیق کیا، وہ اپنی مرضی ومنشاء سے بالکل ٹھیک کیا۔ مکمل اور مناسب۔ وہ علیم وخبیر ہے۔ وہ جانتا ہے کیا ہونا چاہیے۔

تو پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ جو کچھ ہمارے مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں، کیا یہ اس مالک و خالق کی عظیم مشیت کے پروگرام کا حصہ ہیں؟

یہ کالے اور گورے، یہ کمزور اور طاقت ور، یہ ذہین اور کند ذہن، یہ حسین اور بد صورت، یہ امیر اور غریب۔ کیا یہ اس مالک کی مشیت کے مطابق ہیں، یا معاذ اللہ اس رب کائنات نے ایسا کر کے، ظلم کیا ہے؟

کیا ہمیں قدرت کی اس عظیم الشان حکمت پر مبنی پروگرام پر اس خدائے بزرگ وبرتر کے بتائے ہوئے طریقہ سے عمل کرنے کی بجائے، ان بظاہر تفاوات، وتضادات کو اپنی مرضی ومنشاء اور اپنی محدود عقل و دانش سے دور کرنے کی کوششیں کرنی چاہیے؟

کیا ہمیں ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ اگر سب گورے نہیں ہو سکتے تو سب کالے ہو جائیں۔ سب طاقت ور نہیں ہو سکتے تو سب کمزور ہو جائیں۔ سب عقل مند بن نہیں ہو سکتے تو سب کے سب کند ذہن بنا دیئے جائیں۔ سب حسین نہیں بن سکتے تو سب کے سب بد صورت بنا دیئے جائیں۔ اور کیا ہمیں کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ اگر سب انسان خوشحال نہیں ہو سکتے، تو سب کے سب بھیک منگے بنا دیئے جائیں؟؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا یہ سب کچھ ہمارے لیے ممکن العمل بھی ہے؟

اور کیا اس مالک کائنات نے ہمیں ایسا کچھ کرنے کا حکم دے رکھا ہے؟

اور ایسا سب کچھ کرنے کی ہماری یہ کوششیں کائنات کے مالک کی عظیم الشان تدابیر کو کامیاب کرنے کی جدوجہد کہلائیں گی یا ان میں فساد وانتشار کا باعث ہوں گی؟

دوستو۔ وہ خدائے بزرگ و برتر، انسانوں کی طرح سفلی جذبات کا اسیر نہیں۔ وہ پاک ذات ان کوتاہیوں اور خامیوں سے ماورا ہے۔ اس نے جو کچھ تخلیق کیا، جیسا تخلیق کیا، اپنی مشیت کے مطابق بالکل ٹھیک کیا۔ ایک پروگرام کے تحت کیا۔ ضرورت صرف اس پروگرام کو سمجھنے کی ہے۔

آج کی نشست میں، میں خدائی تخلیق کے ایک جز، امیر اور غریب پر بات کروں گا۔

## غربت اور بھوک

دوستو، جیسا کہ آپ میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف ہیں، کہ پچھلی صدی عیسوی میں، دنیا نے ایک نظام کو بنتے اور بکھرتے دیکھا۔ یہ نظام، کمیونزم (بعد میں سوشلزم) تھا۔

اس دور میں کہ جب دنیا میں، ایک طرف رزق کی فراوانی اور اسباب و وسائل سے مالا مال لوگ تھے، تو دوسری جانب، زندگی کی محرومیوں کا شکار بے شمار انسان۔ اس بیک گراونڈ میں اس نظام نے ایسے دلفریب نعرے لگائے، اس طرح لوگوں کے جذبات کو، اپیل کیا۔ انھیں ایک ایسی فرضی دنیا کی تصویر دکھائی، گویا کہ بس اب شہد اور دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی۔ انسانی جذبات کو اپیل کرنے والے ان نعروں نے دنیا کی اکثیریت کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اور یہ نظام بڑی تیزی کے ساتھ، دنیا میں پھیلنے لگا۔

لیکن سچ تو یہ ہی تھا، کہ یہ نظام انسانی جذبات کی توہین کا نظام تھا۔ لوگوں کے دکھ درد اور محرومیوں سے اپنے مکروہ مقاصد کے حصول کا نظام تھا۔

دوستو۔

اس دنیا کی تخلیق کے ساتھ ہی، دو طرح کی قوتوں میں باہمی کشمکش جاری و ساری ہے۔ اور تا قیامت جاری و ساری ہی رہے گی۔ ایک تعمیری قوت اور ایک تخریبی قوت۔ ایک تعمیری سوچ، ایک تخریبی سوچ۔ کیا ہوتی ہیں یہ؟ اس مثال سے سمجھتے ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گلاس میں اس کے نصف تک پانی بھرا ہوا ہے۔ اب دیکھنے والا جب یہ کہے کہ گلاس آدھا بھرا ہوا ہے۔ تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ گلاس آدھا خالی ہے، تو یہ بھی درست ہے۔ لیکن ان دونوں سچائیوں میں ایک شئے سامنے آتی ہے، جو انسان کی سوچ کے، تعمیری یا تخریبی انداز فکر کو ظاہر کرتی ہے۔

اس ہی بات کو ایک اور مثال سے بیان کرتا ہوں۔

ایک سیڑھی ہے۔ ایک شخص اس سیڑھی کے سب سے اوپر والے پائیدان پر کھڑا ہے۔ اور نیچے ایک دوسرا شخص، اس سیڑھی کے ساتھ، فرش پر کھڑا ہے۔ اب یہ نیچے والا شخص یہ چاہے کہ میں اس اوپر والے شخص کے برابر ہو جاؤں، تو اس کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ نیچے والا شخص، محنت کرے، اوپر چڑھنے کی کوشش کرے، اور عمل کرے۔ نتیجتاً یہ بھی اس اوپر والے پائیدان پر پہنچ جائے گا۔ اس طرح یہ بھی اس دوسرے شخص کے برابر ہو جائے گا، ہاں یہ لازمی امر ہے کہ اس عمل میں اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے کافی وقت بھی لگ جائے۔

لیکن اگر یہ شخص نیچے کھڑا، اس سیڑھی کو ہی کھینچ لے، تو نتیجتاً، وہ اوپر والا شخص بھی اس نیچے والے شخص کے برابر ہی آگرے گا۔

دوستو، ان دونوں اعمال میں ہوا کیا۔ نتیجہ ایک ہی نکلا۔ دونوں برابر ہو گئے۔ لیکن پہلے والا طریقہ، تعمیری تھا۔ جس میں اس نیچے والے انسان کی نشوونما ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ مرحلہ کٹھن تھا۔ جب کہ دوسرا طریقہ، تخریبی عمل تھا۔

دوستو غور فرمائیں۔ کون سا طریقہ تھا، جسے اس سوشلزم نے اپنایا؟

یہ نظام یہ بھی کر سکتا تھا کہ دنیا کے ان محروم لوگوں کو، ان کی ذات میں موجود اس کمی سے آگاہ کرتا۔ انھیں بتاتا کہ آخر کیوں وہ زندگی کی ان نعمتوں سے محروم ہیں۔ اور پھر انھیں اس بات کی ترغیب دیتا، کہ وہ اپنے نقائص کو دور کر کے، زیادہ محنت کر کے، زندگی کی ان نعمتوں کو حاصل کر لیں۔ اور اس طرح معاشرے کے ان لوگوں کے برابر ہو جائیں، جو خوشحال ہیں۔ لیکن یہ عمل ایک طویل، صبر آزما، اور کٹھن راستے کا سفر تھا۔ اور انسان عموماً آسان راستوں کا ہی انتخاب کرتا ہے۔ چنانچہ سوشلزم کے ان داعیوں نے، اس تعمیری عمل کو مسترد کرتے ہوئے، اس تخریبی عمل کے راستے کا انتخاب کیا۔ جس میں نہ کوئی محنت تھی۔ اور نہ ہی انتظار۔

کیا کیا سوشلزم نے ؟ کہالو گو۔ سب انسان برابر ہیں۔ سب انسانوں کو برابر ہونا چاہیے۔ یہ لوگ جن کے پاس رزق کی فراوانی ہے۔ جن کے پاس زندگی کی ہر نعمت ہے۔ یہ سب غاصب ہیں۔ ظالم ہیں۔ ان کی وجہ سے تم محرومیوں کا شکار ہو، چنانچہ ان سے ان کی ساری متاع چھین لو۔ ان کے گھر لوٹ لو، ان کی فیکٹریوں پر قبضہ کرلو۔ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب چھین لو۔ اوراس طرح اس معاشرے میں سب ایک جیسے ہو جائیں گے۔

یہ وقت نہیں کہ میں سوشلزم کے ان ظالمانہ نظریات، اور شیطانی منصوبہ بندی پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ ورنہ میں توخود ایک طویل عرصہ اس پر فریب نعرے کا اسیر رہا۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ اس نظام نے انسانیت کی کتنی تذلیل کی۔ کس طرح انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح، ظلم کی چکی میں پسنے پر مجبور کیا۔ انسان، اس کی سوچ، اس کے جذبات، اس کے خیالات، اس کے تصورات، سب کے سب، ایک جرم عظیم بن کر رہ گئے۔ اور انسانوں کا وہ استحصال کیا کہ الامان، الحفیظ۔

یہ ہماری بد قسمتی ہی کہلائی جاسکتی ہے کہ قرآنی فکر کے ہمارے وہ مشہور مفکران اور دانشور، جن سے ہمیں عقیدت بھی ہے اور احترام بھی۔ وہ عین اس دور کے عروج کے زمانے میں، سامنے آئے جب سوشلزم نے اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ دنیا کی اکثیریت کو مسحور کیا ہوا تھا۔ سرسید احمد خان، علامہ اقبال، جناب چکڑالوی، جناب اسلم جیراجے پوری، علامہ غلام احمد پرویز، اور دیگر محترم اکابرین کرام، رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

چنانچہ ہمارے ان اکابرین کرام کا، اس دور کے عمومی رجحانات، اور نظریات سے متاثر ہونا، کوئی ناقابل فہم بات نہیں۔ ان میں سے کچھ احباب نے سرسری انداز میں اس نظام کو لیا، توکچھ نے بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ اس پر کام کیا۔ اور پھر دانستہ یانادانستہ طور پر، قرآن کریم کی تعلیمات کو سوشلزم کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔

ہمارے ان محترم بزرگان نے جب، سوشلزم کو مشرف بہ قرآن کرنے کی سوچی، توان سے ایک بنیادی غلطی ہوئی۔ ہمارے یہ محترم بزرگان، غربت اور بھوک کے فرق کو نہ سمجھ سکے۔

ہمارے ان محترم بزرگان نے بھوک اور غربت کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ ایک دوسرے کا مترادف سمجھا۔ اور پھر قرآن کریم میں جہاں بھی انسانی بنیادی ضروریات کے حوالے سے معاشرے کی ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا تھا، لوگوں کو اس حوالے سے احکام دئے گئے تھے، اسے غربت کے خاتمے کے تناظر میں دیکھا، اور بیان کیا۔

اور اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے، قرآن کریم کی بعض آیات کا ایسا استحصال کیا، جیسا سوشلزم نے انسانی جذبات کا کیا تھا۔

قرآن کریم کی ایک آیت مبارکہ 2/219، کے ضمن میں اپنے مضمون "انفاق" میں، کافی بحث کی ہے، اور تصریف آیات کے قرآنی اصول کے تحت، اس کے اس من مانے مفہوم کو باطل ثابت کر چکا ہوں، جس سے ہمارے سابقین، اور آج کے احباب، یہ نظریہ بیان کرتے ہیں کہ۔

قرآن " کماؤ صلاحیت کے مطابق ، اور خرچ کرو ضرورت کے مطابق " کے اصول کا داعی ہے ۔ ہمارے ان بزرگان نے، غربت کے خاتمے کو عین قرآن قرار دیا۔ اور اس کے لیے چند دوسری آیات قرآنی کو، اپنے من مانے مفہوم کے مطابق بیان کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ قرآن انسانوں میں معاشی مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اور پھر اس خود ساختہ عقیدے کو درست ثابت کرنے کے لیے ایسے ایسے ریت کے گھروندے تعمیر کیے گئے، کہ جو تیز ہوا کا ایک جھکڑ بھی برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

ان آیات پر بات کرنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ ہم اس بنیادی بات کو سمجھ لیں کہ بھوک کیا ہوتی ہے اور غربت کیا ہوتی ہے۔

آپ ایک ایسے معاشرے کا تصور کریں، جہاں لاکھوں لوگ، کھرب پتی ہوں، ہزاروں لوگ ارب پتی ہوں، سینکڑوں لوگ کڑوڑ پتی ہوں۔۔ ذرا ذہن پر زور دے کر سوچیں، کیا اس معاشرے کے یہ کروڑ پتی لوگ، ان کھرب پتی لوگوں کے مقابلے میں غریب نہیں کہلائیں گے ؟

اور پھر یہ سوچیں کہ کیا یہ کروڑ پتی لوگ، جو اس معاشرے میں، دوسروں کے مقابلے میں غریب کہلائیں گے، اپنی بنیادی ضروریات سے محروم سمجھے جائیں گے ؟

کیا ہم ان کروڑ پتی لوگوں کے بارے میں یہ سمجھیں گے کہ انھیں پیٹ بھر کے روٹی دستیاب نہیں؟ علاج کی سہولیات سے محروم ہیں۔۔ یا ان کے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں ہے۔

کیا ہم اس طرح کی کوئی بات سوچ بھی سکتے ہیں؟

دوستو۔

یہ بات بہت اہم ہے۔ اسے بہت توجہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات، اور بات ہے۔ غربت اور بات ہے۔ آپ اپنے مشاہدے پر غور فرمائیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھیں دو وقت کی روٹی ہی دستیاب نہیں۔ یا پہننے کے لیے کپڑے، رہائش کے لیے مکان، علاج کی سہولیات، تعلیم کے مواقع ہی میسر نہ ہوں۔ ایسا نہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ ان کے مقابلے میں لاکھوں دوسرے لوگ ہوں گے، جن کے پاس یہ سہولیات زندگی زیادہ وافر، اور زیادہ اچھی کوالٹی کی ہوں گی۔

لیکن یہ بالکل نہیں ہے کہ یہ لوگ بھوکے سوتے ہوں، ننگے پھرتے ہوں۔ یا علاج کی استطاعت نہ رکھنے کی بناء پر، بغیر دوا کے مر جاتے ہوں۔ ایسا ہر گز نہیں ہے۔

البتہ معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہوں گے، جنھیں پیٹ بھر کر روٹی دستیاب نہ ہو۔ جن کے جسم پر موسم کی مناسبت سے کپڑے نہ ہوں۔ جو اپنا علاج تک نہ کرواسکتے ہوں۔ جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں، لیکن نہیں حاصل کر پاتے۔

اگر ہم تفکر و تدبر کے ساتھ، انسانی معاشروں کو دیکھیں، تو ہمیں تین طرح کے طبقات نظر آتے ہیں۔

## 1۔۔خوشحال طبقہ

یہ وہ طبقہ ہے، جن کے پاس وسائل رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ خوشحال ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں ۔اچھی خوراک کھاتے ہیں۔ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اچھے اسپتالوں سے اپنا علاج کرواتے ہیں۔ ان کے بچے اچھی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انھیں معاشرے کا خوشحال طبقہ کہا جاتا ہے۔

یہ خوشحال طبقہ مزید دو طرح کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

ایک گروہ وہ ہوتا ہے، جو دنیا میں معاشی ناہمواریاں پیدا کر کے، لوگوں کا استحصال کر کے، لوگوں کے ساتھ ظلم کر کے مال کماتا ہے اور زندگی کی نعمتوں کو، اپنے خاندان، اور اپنی قوم تک ہی محدود کر لیتا ہے۔ یہ لوگ بالآخر، قانون مکافات عمل کے شکنجے میں کس دئے جاتے ہیں۔ آخر الامر ناکام و نامراد ہو جاتے ہیں۔

لیکن ان میں دوسری طرح کے وہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو اللہ کریم کے مقرر کردہ طبعی قوانین، اصول و ضوابط کے مطابق، پوری ایمانداری کے ساتھ محنت و مشقت کر کے، اپنے رب کی فرمابرداری کر کے، اس کے حکم کے مطابق

عمل کر کے، اللہ کریم سے رزق بے حساب حاصل کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے اللہ کریم کا مسلسل، متواتر رزق کریم کا وعدہ ہے۔

## 2۔۔سائل و محروم

یہ وہ طبقہ ہے، جو اول الذکر طبقہ کا بالکل الٹ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے پاس نہ کھانے کو روٹی ہوتی ہے۔ نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ ان کے پاس علاج کے وسائل ہوتے ہیں اور نہ ہی تعلیم کی سہولیات۔ یہ معاشرے کا سب سے کمزور، نادار طبقہ ہوتا ہے۔

یہ طبقہ بھی مزید دو طرح کے افراد میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

ایک وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اللہ کریم کے قانون مکافات عمل کے نتیجے میں، تنگی رزق میں مبتلا ہو جاتے۔ جو اللہ کریم کے احکامات کی خلاف ورزی کی صورت میں، اس توہین آمیز زندگی کی سزا میں مبتلا کر دئے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو کسی رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔ نہ اللہ کا قانون ان پر رحم کرتا ہے اور نہ وہ اللہ انسانوں کو ان پر رحم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تا آنکہ یہ لوگ اپنی روش کو بدلیں۔ اپنی کوتاہیوں کا ادراک کریں، توبہ کریں، اصلاح کریں۔ اور قرآن کریم کے اس قانون پر عمل کریں، جس کے نتیجے میں فراوانی رزق حاصل ہوتا ہے۔

لیکن ان میں دوسری طرح کے وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جو کسی جسمانی معذوری کا شکار ہوں، کسی ذہنی معذوری میں مبتلا ہوں۔۔یا کسی وقتی حادثے کے نتیجہ میں، اپنی روٹی خود کمانے سے وقتی طور پر معذور ہو گئے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے لیے قرآن کریم بار بار، اپنے ان بندوں کو جنھیں اس نے اپنی مشیت کے مطابق، فراوانی رزق عطا فرمائی ہے، روٹی کے بندوبست کرنے کا حکم دیتا ہے۔ انفاق کا حکم دیتا ہے۔

## 3۔۔غریب

یہ طبقہ معاشرے کے خوشحال اور نادار طبقے کے درمیان کا طبقہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس نہ تو معاشرے کے خوشحال لوگوں کی طرح فراوانی رزق ہوتی ہے، نہ ان کے معیار کا کھانا ہوتا ہے، نہ کپڑے اور نہ دیگر سہولیات زندگی۔

لیکن دوسری طرف یہ معاشرے کے اس نادار اور لاچار طبقے کی طرح، زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم نہیں ہوتے۔ کہ نہ پیٹ بھر کر روٹی ملے۔نہ مناسب کپڑے، اور نہ رہائش۔

یہ وہ طبقہ ہے کہ جو معاشرے کے خوشحال لوگوں کی طرح، بڑے بڑے گھروں میں نہیں رہتے، نہ عالی شان گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اور نہ ہی تکے، بریانی، حلوے، پراٹھے سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

یہ چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں۔ سائیکل، موٹر سائیکل اور بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ دال سبزی سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں میں اپنا علاج کرواتے ہیں۔ یعنی کسی نہ کسی طور، عزت و وقار کے ساتھ، اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ یعنی نہ تو خوشحال طبقہ کی طرح فراوانی رزق، اور نہ ہی نادار و بے کس طبقے کی طرح تہی دست، جنھیں قرآن، سائل و محروم کہتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں غریب ہیں۔

دوستو۔ عمومی طور پر ہمارے یہاں اس پہلے طبقے کو امیر اور سرمایہ دار کہا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے طبقہ کو غریب کہا جاتا ہے۔ اور یہ ہی وہ بنیادی غلطی ہے جسے ہمارے محترم اکابرین، سمجھنے سے قاصر رہے۔

اگر ہم قرآن کریم کا بغور مطالعہ کریں۔ اس پر غیر جانبداری سے تفکر و تدبر کریں۔ پہلے سے طے شدہ کسی نظریہ کے بغیر سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ حقیقت، روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کتاب عظیم نے ان دو طبقات، یعنی وہ جن کے پاس رزق کی فراوانی ہے، اور وہ جن کے پاس دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔ ان ہی کو موضوع سخن بنایا ہے۔

قرآن اس تیسرے طبقہ پر تو بات ہی نہیں کرتا۔ اور کرے بھی تو کیوں؟

وہ رب جانتا ہے کہ یہ انسانی ارتقاء کے مراحل ہیں۔ وہ لوگ جو آج غریب ہیں، وہ وقت کے ساتھ ساتھ، دن رات محنت کر کے، قوانین خداوندی پر عمل پیرا ہو کر، اپنے رب کے فرمابردار بن کر، اس کے احکامات پر سجدہ ریز ہو کر،

اپنے رب کی مہربانیوں اور عطا سے، رزق کی فراوانی کے مالک بن جائیں گے۔ ترقی و خوشحالی کی منازل طے کر کے، غریب سے خوشحال طبقہ میں شامل ہو جائیں گے۔

یہ عمل انسانی زندگی کا لازم و ملزوم حصہ ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ غربت سے خوشحالی کا یہ سفر، دراصل انسانی ارتقاء کا سفر ہے۔ اس سفر میں انسان کی صلاحیتوں کی نشو نما ہوتی ہے۔ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی وحی کی روشنی میں، ترقی کی منازل طے کر رہا ہوتا ہے۔ غربت سے خوشحالی کا یہ سفر، درحقیقت انسان ذات کی تکمیل کے لیے اپنے رب کی طرف سے مہیا کی گئی وہ بھٹی ہے، جس میں سے گزر کر، وہ اپنی ذات کی ساری کثافت کو دور کر کے، اپنے تزکیہ کی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ وہ مواقع ہیں، جن سے انسان اپنی کامیابی یا ناکامی کا تعین کر سکتا ہے۔ وہ جان سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک اپنی ذات کی نشو نما کر لی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (۹۱:۹)

بیشک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)، (طاہر القادری)

وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۹۱:۱۰)

اور بیشک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)، (طاہر القادری)

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مومن کی زندگی ناکامی و نامرادی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ عسرت اور ناداری کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ ذلت و مسکنت کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ بھوک و بے کسی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ وہ جانتا ہے وہ رب اپنے فرمابرداروں کو عزت کی روٹی، اور خوف سے امان دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ جنت کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ دنیا کے اندھے کو آخرت کا اندھا کہتا ہے۔

یہ ہی تو وہ طبقہ ہے جو اس کائنات کے نظام کو جاری و ساری رکھنے کا مرکزی کردار ہے۔ جو خداوند کریم کی عظیم الشان حکمت پر مبنی اس پروگرام کی ساری مشینری کا بنیادی جز ہے۔ یہ معاشرے کا کوئی حادثاتی حصہ نہیں ہے کہ جو انسانوں کی کسی کوتاہی، یا استبداد سے وجود میں آ گیا ہو کہ جسے ختم کرنے کا خدا حکم دے۔ یہ بہت بڑی غلط نگہی ہے۔

## مفہوم کے نام پر تحریف قرآن

اللہ کریم نے اپنی حکمت بالغہ سے، اس کائنات کو جس طرح چاہا، تخلیق کیا۔ یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے رب کی مشیت کے سارے پروگرام کا احاطہ کر سکے۔ اس رب نے ایک طرف بلند و بالا پہاڑ بنائے، تو دوسری طرف گہری کھائیاں تخلیق کیں۔ ایک طرف ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے رواں کئے، تو دوسری طرف سمندروں کا کھارا، کڑوا پانی۔ ایک طرف سنگلاخ چٹانیں بنائیں، تو دوسری طرف نرم و نازک ریت کے ٹیلے۔ ایک طرف ہرے بھرے سرسبز باغات تخلیق کیے، تو دوسری طرف صحرا۔
ایک طرف ہاتھی، گینڈے، اونٹ جیسے کیم شحیم جانور تخلیق کیے، تو دوسرے طرف، چیونٹی۔ ایک طرف مگرمچھ اور شارک بنائے، تو دوسری طرف ہماری انگلی کی پور سے بھی چھوٹی مچھلیاں۔ ایک طرف ہوا میں محو پرواز، عقاب، چیل، گدھ جیسے بھاری بھر کم پرندے تخلیق کیے، تو دوسرے جانب بظاہر ایک معمولی مچھر۔
ایسا کیوں ہے؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ کیا انسانی عقل آج تک ان سوالوں کا جواب تلاش کر سکی ہے؟
تخلیق کائنات پر تفکر و تدبر ہر روز نئے نئے انکشافات کو سامنے لا رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر نہ تو کوئی تنقید کر سکتے ہیں، اور نہ ہی اس سے سوال۔ کہ اس نے نمک کو کڑوا کیوں بنایا۔ شہد کو میٹھا کیوں بنایا۔ دودھ کو سفید کیوں بنایا۔ لیموں کو کھٹا، گنے کو میٹھا اور نیم کو کڑوا کیوں تخلیق کیا۔
ہم ان پر تفکر و تدبر تو کر سکتے ہیں لیکن اس پر سوال نہیں اٹھا سکتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، بہت ساری باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ بعض آ چکی ہیں۔ بعض آ جائیں گی۔
تو کیا کسی مرحلے پر ہم یہ کہنا شروع کر دیں کہ نہیں جناب، نیم کو کڑوا نہیں ہونا چاہیے، اور کڑوا ہونا ایک منفی صفت ہے تو آؤ۔ مل کر کچھ ایسا کریں کہ یہ نیم میٹھا ہو جائے۔ تو کیا ہماری یہ کوشش مشیت ربانی میں مداخلت سمجھی جائے گی، یا بہت اعلیٰ عمل؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ کیا ہماری کسی کوشش سے یہ نیم میٹھا ہو جائے گا؟

اس ہی طرح انسانوں کی دنیا پر غور کرتے ہیں۔ اس رب کریم نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت اس کائنات میں، انسان کو تخلیق کیا۔ جیسا چاہا تخلیق کیا۔ کسی کو کالا، کسی کو گورا۔ کسی کو طاقتور کسی کو کمزور۔ کسی کو ذہین وفطین، تو کسی کو واجبی سی ذہانت۔ کسی کو حسین ترین، تو کسی کو بد صورت۔

کیا یہ سب کچھ کسی حکمت کے بغیر ہو گیا ہے؟

اب تو سائنس ان میں سے بہت سارے اسرار پر سے پردہ اٹھا رہی ہے کہ کوئی حسین کیوں ہے۔ کوئی کالا کیوں ہے۔ کوئی کند ذہن کیوں ہے۔ یہ موقع نہیں کہ میں ان سائنسی تحقیقات کو سامنے لاؤں۔ لیکن آج سائنس اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہ سب کا سب ایک نظام، ایک حکمت پر مبنی عمل ہے۔ کسی حادثہ کا نتیجہ ہر گز نہیں۔ بلکہ ایک متعین قانون کے ماتحت ہیں۔

اب تو میڈیکل سائنس اس بات پر بھی قادر ہوتی جارہی ہے کہ کالے کی جگہ گورا بچہ پیدا ہو جائے۔ کند ذہن کی جگہ ذہین، بدصورت کی جگہ حسین۔ غور کرنے کی بات ہے، تعمیر کی بات ہو رہی ہے۔ تخریب کی نہیں۔ جو کمی ہے اسے دور کیا جارہا ہے۔ عربی زبان میں اس عمل کو صلح کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی شئے کا ویسا ہونا، جیسا اسے ہونا چاہیے۔ اگر یہ سب کچھ اس رب کریم کی حکمت اور مشیت کے مطابق ہوا ہے، تو کیا رب کی اس حکمت اور مشیت میں کوئی منفی تبدیلی کی کوشش، تعمیر کہلائے گی یا تخریب؟

اللہ کریم نے انسان کو تخلیق کیا۔ اس میں اس کائنات کو سمجھنے کی، سیکھنے کی، اور اسے تسخیر کرنے کی صلاحیت بھی رکھ دی۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ۔۔۔(۲:۳۱)

آدم کو کائنات کا علم عطا فرمایا۔ مفہوم

اور اسے وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ فرمایا

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶:۵)

انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا (ابوالاعلی مودودی)

اور پھر اس کے اندر ان عطا شدہ علوم کی روشنی میں، جو چاہے بن جانے کی ممکنات بھی رکھ دیں۔ اب یہ انسان کا اختیار ہے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے۔

چنانچہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی ان ممکنات اور علم کی بنیاد پر، اپنی محنت کے نتیجہ میں، کوئی ڈاکٹر بن گیا۔ کوئی انجینئر بن گیا۔ کوئی سائنسدان بن گیا۔ کوئی قانون دان۔ کوئی گلوکار بن گیا، کوئی موسیقار۔ کوئی استاد بن گیا، کوئی شاگرد۔ کوئی آجر بن گیا، کوئی مزدور۔

نہ اللہ نے کسی کو ڈاکٹر پیدا کیا۔ نہ کسی کو قانون دان۔ نہ اس نے کسی کو بزنس مین پیدا کیا، نہ مزدور۔ ہر انسان، اپنی مرضی سے جو چاہا بن گیا۔

اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو سب کے سب کیوں ڈاکٹر نہیں بن گئے؟ سب کے سب کیوں بزنس مین نہیں بن گئے؟

کوئی مزدور کیوں بن گیا؟ کوئی کارپینٹر کیوں بن گیا؟

اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے، تو اس بات میں بڑا وزن ہے کہ اگر سب انسانوں کے لیے کچھ بھی بن جانا ممکن تھا، تو کوئی کیوں زیادہ محنت والے کام کو منتخب کرتا ہے ۔ہر کوئی کیوں آسان کام کا انتخاب نہیں کرتا ؟ اس سوال کا جواب ہمارے مشاہدات میں پنہاں ہے۔

کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی مزدور آگے جاکر، بزنس مین بن گیا ہو۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی کارپینٹر، آگے جاکر لکڑی کا کاروبار کرنے لگ گیا ہو۔ کیا ہم نے ایک مزدور کے بیٹے کو ڈاکٹر بنتے نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے کسی الیکٹریشن کے بچے کو، انجینئر بنتے نہیں دیکھا؟

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ وہ لوگ جو کسی زمانے میں نائی کہلاتے تھے، لوگوں کے گھروں میں جاکر شادی بیاہ کا کھانا پکایا کرتے تھے۔ آج بڑے بڑے ریستوران کے مالک بن گئے ہیں۔

وہ جو لوگوں کے بال کاٹتے تھے، آج بڑے بڑے بیوٹی پارلر کے مالک بن گئے ہیں۔

یہ سارے مشاہدات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس رب کائنات نے ہر انسان کو ہر طرح کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ نہ کسی کو نائی پیدا کیا۔ نہ کسی کو مزدور۔ نہ کسی کو کارپینٹر پیدا کیا اور نہ کسی کو الیکٹریشن۔ ہر انسان اپنی محنت سے

جو چاہے بن جاتا ہے۔ جو جتنی محنت کرتا ہے اتنا پالیتا ہے۔ البتہ اس عمل میں تین بنیادی فیکٹر ہیں۔ ایک مسلسل جدوجہد، دوسرا وقت، اور تیسرا مواقع۔

اگر آج کوئی انسان اپنی چند سالہ محنت کے نتیجے میں، ایک کارپینٹر بن پایا ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ساری زندگی کارپینٹر ہی رہے۔ اگر وہ آگے بڑھنا چاہے تو ترقی کی ساری شاہراہیں اس کے لیے کھلی ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی موجودہ حیثیت پر مطمئن ہوکر، ایک جگہ ٹھہر گیا ہے، توساری عمر وہ کارپینٹر ہی رہ جاتا ہے۔

مشیت خداوندی کے مطابق، انسان مختلف جذبات کا مرکب ہے۔ غم، خوشی، غصہ، ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، محبت ، نفرت، وغیرہ۔

اس ہی طرح انسان میں ایک اور جذبہ ہوتا ہے۔

## مسابقت کا جذبہ

دوسروں سے آگے نکل جانے کا جذبہ۔ ترقی کرنے کا جذبہ۔ سچ تو یہ ہے کہ کائنات کا سارا نظام اس ایک جذبے کا مرہون منت ہے۔ تسخیر کائنات، ترقی و تعمیر۔ یہ سب کچھ اس ایک جذبہ ہی کے بدولت ہے۔ اگر کہیں انسان میں یہ جذبہ ہی ختم ہو جائے، توسب کچھ مٹی کا ڈھیر ہے۔ مسابقت کا یہ جذبہ، انسانوں کی ترقی و پستی، عروج و زوال کا ذمہ دار ہے۔ اس جذبہ کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے۔ فرمایا۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا (۲۵:۲۰)

چونکہ انسان مدنی الطبع ہے، اس لیے مختلف افراد کے مفاد کا باہمی تصادم ہوتا ہے۔ لیکن اس ہی سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود بھی ہوتی ہے۔ یوں مختلف افراد ایک دوسرے کے لیے کٹھالی کا کام دیتے ہیں۔

(تبویب القرآن صفحہ نمبر 265، ٹائیٹل انسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔از علامہ پرویز علیہ رحمہ)

اس جذبہ مسابقت کے حوالے سے مزید فرمایا۔

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (۵۷:۲۰)

ان کی نگاہیں صرف طبعی زندگی کے پیش پیش پا افتادہ مفاد پر ہوتی ہیں حالانکہ قرآن کریم کے دیئے ہوئے بلند تصور کے مقابلے میں طبعی مفاد کی حیثیت محض) کھیل تماشے کی سی ہوتی ہے، جس سے کچھ وقت کے لیے دل بہلا لیا جائے ۔ یا زیبائش و آرائش کر لی جائے۔ یا اس پر فخر لیا جائے، کہ میرے پاس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ساز و سامان ہے۔ یا مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ لگائی جائے،(یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ بشر طیکہ انھیں زندگی کے بلند و بالا مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر انھیں مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو یہ تصور باطل ھے۔ اس طرح ان سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اس کی مثال) ایسی کھیتی کی سی ہے، جو بارش کے ایک چھینٹے سے اٹھ کھڑی ہو، اور اسے دیکھ کر کسان خوش ہو جائے، لیکن ایسی کھیتی دوسرے دن ہی خشک ہونا شروع ہو جاتی ہے ۔ ذراسی دھوپ سے زرد پڑ جاتی ہے، اور پھر چور چور ہو کر مرجھا جاتی ہے۔ اور مآل کار اس کسان کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ ان تباہیوں سے بچنے کی ایک صورت یہ ہی ہے کہ انسان اپنی تمام جدوجہد کو، قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔

پھر سمجھ لو کہ محض طبعی زندگی کو مقصود حیات سمجھ لینے سے سامان زیست تو ضرور مل جاتا ہے، لیکن وہ متاع بڑی ناپائیدار، اور کم قیمت کی ہوتی ہے۔ اور اس سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے۔

(مفہوم القرآن از علامہ غلام احمد پرویزؒ)

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں، جو دن رات محنت کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جن کا نعرہ ہی یہ ہوتا ہے۔ کام۔ کام۔ کام۔

لیکن ہم ایسے بے شمار لوگوں سے بھی واقف ہیں، کہ جو کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ مٹی کے پتلوں کی طرح، بیٹھے آسمان پھٹنے اور دھن برسنے کے منتظر رہتے ہیں۔ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو دوسروں کے سر مونڈھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

درحقیقت یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو مسابقت کے اس جذبے سے ہی محروم ہوتے ہیں۔ یہ بغیر کسی محنت کے کچھ پا لینے کی تھیوری پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کو ہتھیانے کے گُر تلاش کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہی وہ لوگ تھے، جنہیں سوشلزم نے زندگی عطا کی۔ اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے جواز فراہم کیے۔ انھیں اس بات پر مطمئن و مسرور کر دیا کہ آج اگر کوئی کامیاب ہے۔ خوشحال ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کسب معاش کی صلاحیت قدرتاً زیادہ ہے۔

اور اگر تم ناکام ہو، ہو، تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں قدرتاً روٹی کمانے کی صلاحیت کی کمی ہے۔

اور اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان کو اپنی صلاحیت کے مطابق کمانا چاہیے، اور اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر، باقی سب ان لوگوں کو دے دینا چاہیے جو کم صلاحیت ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

اسے کہتے ہیں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ یہ سارے کے سارے اس نعرے کے پیچھے چل پڑے۔ (آج سوشلزم کی ناکامی نے اس پرفریب نعرے کے غیر منطقی، اور غیر فطری ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے) اگر بات صرف سوشلزم تک ہی محدود رہتی تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا، کہ جس دن سوشلزم فنا ہوا۔ یہ نام نہاد، پرفریب اور غیر قرآنی نعرہ بھی اپنی موت مر جاتا۔

لیکن ہمارے ان محترم اکابرین کا کیا کریں، کہ جنھوں نے سوشلزم کے اس معاشی تصور کو قرآن کے مطابق ثابت کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آیت مبارکہ 2/219، کی طرح دو آیات قرآنی کا انتخاب کیا۔ پہلے میں وہ آیات قرآنی پیش کرتا ہوں۔

1۔ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ(۱۶:۷۱)

یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں، اکتساب رزق (کمانے)صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ایک کو ایک قسم کی صلاحیت زیادہ حاصل ہوتی ہے، دوسرے کو دوسری قسم کی (یہ اس لیے کہ دنیا میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں جن کے لیے مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں میں اکتساب رزق کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنی ساری کمائی اپنے لیے سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ضروریات سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں۔ سو یہ لوگ اپنی فاضلہ دولت کو ان لوگوں کو واپس کیوں نہیں دے دیتے، جو ان کے زیر ہدایت کام کرتے ہیں۔اور جن کا یہ در حقیقت حق ہے، تاکہ اس طرح سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہو سکیں۔

جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ در حقیقت اس سے انکار کرتے ہیں، کہ ان کی زیادہ صلاحیت انھیں خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ھوئی ہے۔۔ حالانکہ ان کی بنیادی صلاحیتیں، اور سامان رزق سب خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہے ۔ قارون کو بھی اس ہی قسم کا زعم تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس ہی غلط نظریہ پر قائم ہے

۔

(مفہوم القرآن از علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ)

2۔ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۴۳:۳۲)

اچھا، تو گویا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نبوت جیسی چیز بھی، جو خالصتاً خدا کی رحمت اور موہبت ہے، ان کے معیار کے مطابق بانٹی جایا کرے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نبوت تو بہت بڑی چیز ہے، دنیاوی زندگی کی معیشت بھی ان کے معیاروں کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی۔۔ اکتساب رزق کی بنیادی استعداد اور صلاحیت مختلف افراد میں، مختلف ہوتی ہے۔اور اس ہی لیے، ہر ایک کی کمائی، میں فرق ہوتا ہے۔ استعدادوں کا یہ فرق، اس لیے رکھا گیا ہے کہ معاشرے میں مختلف کام ہوتے ہیں جن کے لیے، مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا اجتماعی کاروبار اس ہی طریق سے چلتا ہے۔ لیکن اس سے تکریم انسانیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو جب اکتساب رزق کی بنیادی

صلاحیت و استعداد کی یہ کیفیت ہے کہ وہ افراد کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی، خدا کی عطا کردہ ہوتی ہے، تو نبوت جیسی موھبت عظمٰی جو دنیاوی مال ومتاع سے کہیں زیادہ بلند مرتبت ہے، لوگوں کے معیار کے مطابق کس طرح مل سکتی ہے ۔ یہ خدا کی موھبت ہے جس کے لیے وہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق مناسب شخصیت کا انتخاب کرتا ہے (مفہوم القرآن از علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ )

مذکورہ بالا دونوں آیات مبارکہ سے وہ بات جو سوشلزم کہہ رہا تھا، کہ ہر انسان میں اکتساب رزق کی صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگ زیادہ کما لیتے ہیں اور کچھ لوگ کم کماتے ہیں۔ اور اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ لوگ جو اکتساب معاش کی بہتر صلاحیتوں کی بناء پر زیادہ کما لیتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کمائی، ان لوگوں کی طرف لوٹا دیں جو کم کمانے کی صلاحیت کی بناء پر، پیچھے رہ گئے ہیں، کو قرآنی سند عطا کر دی گئی۔ سوشلزم چونکہ خدا کے وجود ہی کا قائل نہ تھا، اس لیے اس نے تو پھر بھی یہ مہربانی کی کہ ان کم اور زیادہ صلاحیتوں کے تصور کو " اتفاقی " قرار دیا۔ لیکن ہمارے ان معزز اکابرین نے تو اس گمراہ کن عقیدہ کو اللہ کریم کے کھاتے میں ڈال دیا۔

جیسا کہ میں بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ اپنے اسلاف کے حوالے سے میں ہمیشہ حسن ظن کا قائل ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ بھی کیا، ان کی اتنی ہی فہم تھی۔ وہ سب دین سے مخلص تھے۔ اگر قرآن کریم کی کسی مخصوص آیت کو انھوں نے اپنے وقت کے عمومی مزاج کے مطابق سمجھا، تو یہ ایک انسانی سہو تھا۔

ان دونوں آیات مبارکہ کے حوالے سے عربی زبان، قائدے، گرامر اور لغت سے بات کرنے سے پہلے چند بنیادی باتیں پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

یہ کتنی بڑی جسارت ہے کہ وہ رب کائنات، جو اپنے بندوں پر ہر لمحہ مہربان ہے۔ جو عادل بھی ہے، اور بصیر بھی، علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ کائنات میں موجود ہر شئے، روزانہ ہمیں اس خالق ومالک کے عطا شدہ توازن اور عدل کا مشاہدہ کرواتی ہے اس کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کیا جائے کہ اس نے انسانوں میں اسکی پیدائش کے ساتھ ہی صلاحیتوں کا فرق رکھا ہے؟

کسی کو کوئی صلاحیت دے دی، تو کسی کو کوئی صلاحیت ؟

اس کا سادہ سا معنی تو یہ ہی ہوا نہ ، کہ اگر آج کوئی ڈاکٹر ہے، تو اس وجہ سے کہ اس میں خدا نے ڈاکٹر بننے کی صلاحیت رکھی تھی۔ اور اگر آج کوئی سوئپر ہے، تو اس میں سوئپر بننے کی صلاحیت رکھی ہوئی تھی۔

اب اگر کسی کے اندر سوئپر بننے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہو، تو وہ ڈاکٹر کیسے بن سکتا ہے ؟

اگر کسی میں مزدور بننے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہو، تو وہ آجر کیسے بن سکتا ہے ؟

ذرا غور فرمائیں۔ کیا بات کی جارہی ہے۔

مزید کہا کہ جی مختلف افراد میں کسب معاش کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگ زیادہ کما لیتے ہیں، اور کچھ لوگ کم کماتے ہیں۔

ذرا اس پر بھی غور فرمائیں۔

کیا یہ وہ ہی عقیدہ نہیں جو صدیوں سے ہماری مذہبی پیشوائیت پیش کرتی چلی آرہی ہے۔

کیا کہتے رہے ہیں یہ لوگ۔ یہ ہی نہ کہ اگر تم غریب ہو، تو اس لیے کہ اللہ تمہیں غریب پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی امیر ہے تو اس لیے کہ اللہ اسے امیر پیدا کرتا ہے۔ اگر تم محکوم ہو تو اس لیے کہ اللہ تمہیں محکوم پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی بادشاہ ہے تو اس لیے کہ اللہ نے اسے بادشاہ پیدا کیا۔ رام کی لیلا ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ نکتہ نواز ہے۔ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ جسے چاہے پکڑ لے جسے چاہے چھوڑ دے۔

اب آپ یہ ہی بات الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ شراب کی بوتل پر روح افزاء کا لیبل لگا رہے ہیں۔ کہ جی اللہ نے مختلف لوگوں میں مختلف صلاحیتیں رکھیں ہیں۔ کسی کو زیادہ کمانے کی صلاحیت عطا کر دی ہے کسی کو کم کمانے کی۔

تو مجھے بتایا جائے کہ جب مجھ میں زیادہ کمانے کی صلاحیت ہی نہ ہو گی، تو کس طرح میری ساری زندگی کی محنت کوئی خوشگوار نتیجہ بر آمد کر سکے گی ؟

اگر مجھ میں زیادہ کمانے کی صلاحیت ہی نہیں، تو اس ہی کا نتیجہ تو افلاس ہو گا۔ بھوک ہو گا۔ میں کچھ بھی کر لوں، ساری عمر بھیک منگا ہی رہوں گا۔

تو پھر وہ "عقیدہ تقدیر" ہی درست ہوا نہ۔ وہ مجوسی عقائد، وہ ہندو مت کے برہمن اور شودر وا چھوت۔

اگر خدا ہی یہ چاہے کہ فلاں انسان مزدور بنے، تو مجھے بتائیں کہ وہ بزنس مین کیسے بن سکتا ہے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳:۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (فتح محمد جالندہری)

اب اگر کسی انسان میں آپ نے وہ صلاحیت ہی نہ رکھی ہو، تو اس کی کوشش کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟

جب کسی انسان میں سو روپے کمانے کی صلاحیت رکھ دی گئی، تو وہ بے چارہ سو سے زیادہ کیسے کما سکتا ہے؟

جس میں لاکھ کمانے کی صلاحیت رکھ دی، تو اس میں اس کا کیا کارنامہ ہے؟

تو پھر آیت بالا، کس سعی کی بات کر رہی ہے۔ بات تو پھر سعی کی رہی ہی نہیں۔ سو کی صلاحیت رکھنے والا، کتنی ہی سعی کر لے۔ ملے گا تو سو ہی۔

تو پھر قرآن کا وہ دعویٰ کیا ہوا کہ اس کی آیات میں باہم تصادم نہیں ہے؟

ذرا غور فرمائیں، ایک غیر قرآنی عقیدہ کو قرآنی ثابت کرنے کے لیے، کسی انتہا تک چلے جاتے ہیں لوگ۔

لیکن ٹھیریں۔ میں یہاں ایک اور تحریر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ کہا۔

"دنیا میں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں، سب انسانی بچے ہوتے ہیں۔ یعنی انسان ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی بچہ پیدائش کے لحاظ سے نہ امیر ہوتا ہے نہ غریب۔ نہ سید ہوتا ہے نہ پٹھان۔ نہ ادنیٰ ہوتا ہے نہ اعلیٰ۔ نہ افسر ہوتا ہے نہ ماتحت۔ لیکن ان بچوں میں ہم خود فرق پیدا کر لیتے ہیں

(اسلامی معاشرت باب دوئم صفحہ نمبر 20۔ از علامہ پرویز علیہ رحمہ)

ایک طرف یہ کہنا کہ انسانوں میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے، مختلف طرح کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اگر معاشرے کو ایک بھنگی کی ضرورت ہے، تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، اس خدا نے، انسان کے کسی بچے میں پیدائش کے وقت ہی بھنگی بننے کی صلاحیت رکھ دی تھی۔ تو اب وہ بے چارہ بھنگی ساری عمر، بھنگی ہی رہے گا۔ کیونکہ اس میں کسی اور کام کی صلاحیت تو ہے ہی نہیں۔

لیکن دوسری طرف فرماتے ہیں۔ کہ پیدائش کے لحاظ سے، کوئی بچہ نہ امیر ہوتا ہے نہ غریب، نہ سید ہوتا ہے نہ پٹھان ۔نہ ادنیٰ ہوتا ہے نہ اعلیٰ۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

غور فرمایا آپ نے۔ جب کسی غیر قرآنی نظریہ کو قرآنی ثابت کرنے کی زبردستی کوشش کی جائے، تو اس طرح کے تضادات تو ملیں گے ہی۔

لیکن کیا یہ تضادات ، ہمارے کسی بزرگ کی کم فہمی کا نتیجہ ہے یا ، معاذاللہ قرآن اس کا ذمہ دار ہے ؟ قرآن تو واضح الفاظ میں کہتا ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ(۱۹:۴۶)

اور لوگوں نے جیسے کام کئے ہوں گے ان کے مطابق سب کے درجے ہوں گے۔ غرض یہ ہے کہ ان کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان کا نقصان نہ کیا جائے (فتح محمد جالندہری)

جیسے اعمال ویسا بدلہ۔ اور ظاہر ہے کی کسی بھی عمل کے لیے اس کی صلاحیت کا ہونا لازمی ہے اگر کسی میں وہ عمل کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو، جس سے اس کے درجات بلند ہوں، تو بھلا کیسے کوئی اپنے درجات کو بلند کر سکتا ہے ؟

اب آیئے اپنے روزمرہ کے مشاہدات پر۔ قرآن فہمی کے اصولوں میں ایک اہم اصول انسانی مشاہدات بھی ہے۔

مثلاً یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ اب قرآن کریم کی کوئی آیت، جس کا یہ مفہوم نکلتا ہو، کہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے، غلط ہو گا۔ ہمیں اس آیت پر غور کرنا ہو گا، اور اس کے درست مفہوم کا تعین کرنا ہو گا۔

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ بے شمار ایسے لوگ ہیں جو پڑھے لکھے، سمجھدار، محنتی، جدوجہد کرنے والے، ہنرمند، باشعور ہوتے ہیں لیکن معاش کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہوتی ہے۔ جستجو ہوتی ہے۔ لیکن معاشی لحاظ سے آسودہ نہیں ہوتے۔

ان کے مقابلے میں بے شمار ایسے لوگ بھی ہمارے علم میں ہوتے ہیں جن کے پاس رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اکثر ان کے لیے حیرت اور تعجب سے کہتے ہیں کہ بس یار اللہ کی مرضی ہے۔ ورنہ اس سیٹھ صاحب کو تو اچھی طرح بات کرنی بھی نہیں آتی۔

میں خود ایسے کئی سیٹھ صاحبان سے بالمشافہ مل چکا ہوں، جو اردو یا انگریزی میں دستخط بھی نہیں کر سکتے۔ اب اگر بات کسب معاش کی صلاحیت کی ہوتی، تو ان اول الذکر لوگوں کو تو کروڑوں پتی ہونا چاہیے۔ اور ثانی الذکر کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملنی چاہیے۔

بات کسب معاش کی صلاحیتوں کی نہیں ہے۔ قانون مشیت کی ہے۔

رزق کی فراوانی اور تنگی، دونوں اس رب کریم کے قانون مشیت کے مطابق ملتے ہیں۔ ایک ہوشیار، عقلمند، ذہین و فطین انسان، تمام تر گر جاننے کے باوجود، اللہ کے اس قانون مشیت کی خلاف ورزی کے سبب بھوک، افلاس اور ذلت کا شکار ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک سیدھا سادہ عبد مسلم، اپنے رب کا فرمابردار، اس کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے والا، عام معنوں میں کم فہم، بغیر حساب رزق کا حقدار بن جاتا ہے۔ وہ رب اپنے عبد کو اپنے فرشتوں کے ذریعے، کامیابی و کامرانی کی راہیں سجھا دیتا ہے۔ یہ ذاتی صلاحیتوں کی بات نہیں ہے۔ اس رب کریم کی رحمتوں اور عطا کی بات ہے۔ شرط صرف اس رب کی فرمابرداری ہے۔ اس کے حکم کے مطابق چلنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۴۱:۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم خوف نہ کرو اور نہ غم کرو اور تم جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا،

(طاہر القادری)

نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (۳۱:۴۱)

ہم دنیا کی زندگی میں (بھی) تمہارے دوست اور مددگار ہیں اور آخرت میں (بھی)، اور تمہارے لئے وہاں ہر وہ نعمت ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہاں وہ تمام چیزیں (حاضر) ہیں جو تم طلب کرو، (طاہر القادری)

غور فرمائیں کیا کہہ رہا ہے قرآن۔ کہا کہ وہ لوگ جو اس بات کا عہد کر لیتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، اور اپنے اس ایمان پر ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کہہ دینا کہ اللہ ہمارا رب ہے، اس میں کون سی استقامت والی بات ہے؟ کون روکتا ہے آپ کو ایسا کہنے سے؟

آج آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں۔ حتیٰ کہ اسرائیل میں بھی۔ کوئی نہیں روکتا آپ کو۔ آپ جسے چاہیں اپنا رب مان لیں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

تو پھر اس آیت مبارکہ کا کیا مطلب ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ بات صرف کسی کو اپنا رب مان لینے کی ہے ہی نہیں۔ بلکہ اس سے آگے کی ہے۔

یہ شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جب کوئی عبد مومن اپنے رب پر ایمان لاتا ہے، تو وہ اپنے رب کے تمام احکامات کا پابند ہو جاتا ہے۔ وہ ان احکامات و ہدایات کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ کرتا ہے۔ ان ہدایات کی روشنی میں ایک معاشرے کے قیام کی جدوجہد کرتا ہے۔

یہ ہی وہ مقام ہے جہاں، دوسروں کا اعتراض شروع ہوتا ہے۔ مخاصمت، مخالفت، جنگ، شروع ہوتی ہے۔ ایک جانب طاغوتی قوتیں ہوتی ہیں، جو اس عمل کو روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف یہ عبد مومن، ہر قسم کے نفع و نقصان سے بے پرواہ۔ اس اعلان کا عملی نمونہ۔

قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۲:۱۵۶)

کہ نہ تو یہ مال ہمارا اپنا ہے، نہ یہ اولاد۔ نہ یہ باغات۔ اور نہ ہماری جانیں۔ یہ سب میرے رب کی عطا ہے۔ اور آخر الامر سب نے اس رب کی طرف لوٹ جانا ہے۔ تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر ہم اپنے رب کی فرمابرداری کرتے ہوئے، اپنی جان گنوا دیں۔ اپنا مال گنوا دیں۔ اپنی اولاد گنوا دیں۔ سب کچھ گنوا دیں۔ یہ سب ہمارا تھا ہی کب؟ ہمارے لیے تو بس یہ ہی راستہ درست ہے کہ اپنے رب کے حکم پر سجدہ ریز ہو جائیں۔ اس کے مطیع بن جائیں، اس کے فرمابردار بن جائیں۔ یہ ہی کامیابی ہے۔

اور پھر یہ ہی وہ مقام ہے جہاں اس عبد مومن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

کیا کہتے ہیں یہ ملائکہ۔ کہا بہت خوب۔ تم اپنے امتحان میں پاس ہو گئے ہو۔ تم نے اپنے رب کی رضا پالی ہے۔ سو تم کوئی غم نہ کرو۔ تم پریشان بھی نہ ہو۔ یہ طاغوتی قوتیں، تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے مددگار ہیں۔ اور مرنے کے بعد، تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں ہر وہ شئے ملے گی، جس کی تم خواہش کرو گے۔ جس کی تم آرزو کرو گے۔

دوستو۔ بہت غور کرنے کا مقام ہے۔ سوچیں عملی زندگی میں کیا ہوتا ہے؟

انسان ہر لمحہ ایک دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اسے دو میں سے ایک راستے کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ اگر اس دوراہے پر انسان درست راستے کا انتخاب کرلیتا ہے، تو کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومتی ہے۔ اگر غلط راہ منتخب کرلیتا ہے، تو ناکامی اور نامرادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

زندگی کے ان دو راہوں پر درست یا غلط فیصلہ۔ انسان کی ساری عمر کی کامیابی اور ناکامی کی داستان ہے۔ عروج و زوال کی کہانی ہے۔ عزت یا ذلت کا پیمانہ ہے۔

یہ ہی وہ مقام ہے جہاں یہ عبد مومن، ان ملائکہ کی مدد سے درست راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ ملائکہ ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں درست اور غلط کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انہیں اندھیروں سے اجالوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ کوئی کاریگری نہیں ہے۔ کوئی فنکاری نہیں ہے۔ بس عطاہی عطاہے۔

ذرا تصور فرمائیں اس منظر کا۔ ایک طرف ہزاروں کا لشکر۔ سامان حرب سے لیس۔ دنیاوی سہولتوں کے ساتھ حملہ آور۔ دوسری طرف 313، افراد پر مشتمل، مفلوک الحال، غریب الوطن۔ نہ مال ہے نہ اسباب۔ لیکن اپنے رب کے عبد خالص۔

توپھر کیاہوا۔ کہا۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (٨:٩)

اور وہ موقع یاد کرو جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہاہوں (ابوالاعلی مودودی)

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (١٠:٨)

یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لیے بتادی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد توجب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور داناہے (ابوالاعلی مودودی)

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (٨:١١)

جب اس نے اپنی طرف سے (تمہیں) راحت و سکون (فراہم کرنے) کے لئے تم پر غنودگی طاری فرمادی اور تم پر آسمان سے پانی اتارا تاکہ اس کے ذریعے تمہیں (ظاہری و باطنی) طہارت عطا فرمادے اور تم سے شیطان (کے باطل وسوسوں) کی نجاست کو دور کردے اور تمہارے دلوں کو (قوتِ یقین) سے مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدم (خوب) جمادے، (طاہر القادری)

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (١٢:٨)

اے حبیبِ مکرم! اپنے اعزاز کا وہ منظر بھی یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں کو پیغام بھیجا کہ (اَصحابِ رسول کی مدد کے لئے) میں (بھی) تمہارے ساتھ ہوں، سو تم (بشارت و نصرت کے ذریعے) ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، میں ابھی کافروں کے دلوں میں (لشکرِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا) رعب و ہیبت ڈالے دیتا ہوں سو تم (کافروں کی) گردنوں کے اوپر سے ضرب لگانا اور ان کے ایک ایک جوڑ کو توڑ دینا، (طاہر القادری)

غور فرمائیں۔ کیا کرتے ہیں یہ ملائکہ ۔ انسان کی سوچ، اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی درست راہوں کی طرف راہنمائی کر دیتے ہیں۔ ان کے دلوں سے خوف کو دور کر دیتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یقین اور کامیابی بھر دیتے ہیں۔

اور یہ ہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں بڑے بڑے فنکار، ناکام ہو جاتے ہیں۔ اور ایک عام سا سیدھا سادہ عبد مومن ان سب پر غالب آجاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دوستوں کی زندگی میں بھی اکثر ایسے مقامات آئے ہوں گے کہ جب آپ کسی معاملے میں، شش و پنج میں مبتلا ہو گئے ہوں گے۔ کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی ہو۔۔ حُزن و یاس آپ کو گھیرے ہو اور پھر اچانک، ذہن میں ایک سوچ کوند جائے۔ اجالا پھیل جائے۔ درست راہ نظر آجائے۔

سفینے ناخدا کے آسرے پر چل تو سکتے ہیں
خدا وہ ہے، ضرورت جس کی طوفانوں میں ہوتی ہے

میری ساری عمر اس رحمت و نعمت ربی سے عبارت ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے عبد کو ناکام نہیں کرتا۔ کبھی تنہا نہیں چھوڑتا ۔ کبھی بھوک و افلاس کا شکار نہیں کرتا۔ کبھی دنیا میں ذلیل و رسوا نہیں کرتا۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو، تیری عفوو بندہ نواز میں

آیئے ہم ان آیات مبارکہ کو عربی زبان کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی آیت مبارکہ ہے۔

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (۱۶:۷۱)

یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں، اکتساب رزق (کمانے) صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کو ایک قسم کی صلاحیت زیادہ حاصل ہوتی ہے، دوسرے کو دوسری قسم کی (یہ اس لیے کہ دنیا میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں جن کے لیے مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں میں اکتساب رزق کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنی ساری کمائی اپنے لیے سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ضروریات سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں۔ سو یہ لوگ اپنی فاضلہ دولت کو ان لوگوں کو واپس کیوں نہیں دے دیتے، جو ان کے زیر ہدایت کام کرتے ہیں۔ اور جن کا یہ در حقیقت حق ہے، تاکہ اس طرح سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہو سکیں۔

جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ در حقیقت اس سے انکار کرتے ہیں، کہ ان کی زیادہ صلاحیت انھیں خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ھے۔ حالانکہ ان کی بنیادی صلاحیتیں، اور سامان رزق سب خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہے۔ قارون کو بھی اس ہی قسم کا زعم تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس ہی غلط نظریہ پر قائم ہے۔ (مفہوم القرآن از علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ)

ذرا غور فرمائیں۔ اس آیت مبارکہ میں کوئی ایک لفظ ایسا ہے؟ جس کے معنی "کسب معاش کی صلاحیت" بنتا ہو؟

اس آیت میں جس لفظ سے ہمارے بزرگ نے "کسب معاش کی صلاحیت" مفہوم لیا ہے۔ وہ ہے۔ **"فضل"**۔

پہلے لغت سے معلوم کرتے ہیں، کہ اس لفظ **"فضل"** کا درست معنی کیا ہے۔

الفضل۔ نقص، کمی کی ضد ہے۔ الفضیلۃ۔ مرتبہ کی بلندی اور برتری کے ہیں۔ تفضل علیہ۔ کے معنی ہیں، وہ اس سے برتری میں بڑھ گیا۔ (لغات القرآن از جناب پرویز علیہ رحمہ)

چنانچہ اس لفظ کے درست معنی، برتری کے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالی ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (۲:۲۵۳)

یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰ ابن مریمؑ کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ (ابو الاعلی مودودی)

اب غور فرمائیں، اگر اس لفظ کے معنی کسب معاش کی صلاحیت ہے، تو کیا اس آیت مبارکہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ، معاذ اللہ، کچھ انبیاء میں زیادہ کمانے کی صلاحیت تھی، اور کچھ میں کم۔

قرآن کریم میں یہ لفظ معاشی خوشحالی، ترقی، کامیابی، جنگ میں فتح، تلاش رزق، وحی خداوندی، اور اپنی ہم عصر اقوام میں ممتاز پوزیشن کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اس لفظ سے کسب معاش کی صلاحیت کا مفہوم لینا، بہت بڑی جرات کی بات ہے۔ تحریف قرآن کے مترادف ہے۔

اس ہی آیت مبارکہ میں قرآن کریم کی ایک مخصوص اصطلاح " مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ " بھی خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ آیئے پرویز علیہ رحمہ کی زبانی اس کے معنی و مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ [:] إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ (۲۳:۶)

اور انھوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا۔ اور انھیں صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا۔ یا ان لونڈیوں پر جو (انسداد غلامی کے متعلق قرآنی احکامات نازل ہونے سے پہلے) ان کی ملک میں آچکی تھیں۔ لیکن جنھیں نکاح کے بعد، بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا ہے، ان سے زناشوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔

(مفہوم القرآن از جناب پرویز علیہ رحمہ)

مزید

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ (۷۰:۳۰)

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں، کہ وہ تجرد کی راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جنسی تعلقات کو حدود خداوندی کے دائرے میں رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنی منکوحہ بیوی کے پاس جاتے ہیں۔ یا ان لونڈیوں کے پاس جو اس سے پہلے (عرب کی عام معاشرت کے مطابق) ان کے ہاتھ لگ تھیں۔ اور جنہیں اب بیویوں کا درجہ دے کر ان سے جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ھے۔ البتہ اس کے بعد، اس طرح لونڈیاں حاصل کرنے کا طریقہ ختم کر دیا گیا ہے۔

(مفہوم القرآن از جناب پرویز علیہ رحمہ)

مزید ملاحظہ فرمائیں۔

"قرآن میں ما ملکت ایمانکم ،لونڈی غلاموں سے متعلق جو احکامات ہیں، وہ ان لونڈیوں اور غلاموں کی بابت ہیں، جو اس وقت عربی معاشرے میں موجود تھے۔ جب وہ غلام باقی نہ رہے، تو وہ احکام بھی ختم ہو گئے"

(قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں، یتیم پوتے کی وراثت: از جناب پرویز علیہ رحمہ، صفحہ نمبر 57)

پرویز علیہ رحمہ کے پیش کردہ مفاہیم سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک اس لفظ "ماملکت ایمانھم "، کا مفہوم دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود وہ غلام اور لونڈیاں ہیں، جو اسلام کی آمد سے پہلے عرب معاشرے کا ایک قابل ذکر حصہ تھے۔ لیکن اسلام نے اس ننگ انسانیت عمل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ چنانچہ، قرآن کریم میں جہاں بھی یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس سے مراد اس مخصوص دور کے غلام اور لونڈیاں ہیں۔

لیکن کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ اس مخصوص آیت مبارکہ، [١٦:٧١]، میں اس اصطلاح کا وہ مفہوم بیان کیا جارہا ہے ،جو پرویز علیہ رحمہ کے پیش کردہ عمومی مفاہیم سے براہ راست متصادم ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ کسی سابقہ مخصوص دور کے تناظر میں نازل شدہ ایک آیت مبارکہ کو محض اپنے مخصوص نظریہ کو سند دینے کے لیے اپنی مرضی کے معنی و مفہوم دیے جائیں۔

اس مخصوص آیت مبارکہ کے حوالے سے، میں اپنے اس حسن ظن کو بھی پکار رہا ہوں کہ انسانی سہو ہے؟ کیا یہ انسانی سہو ہے؟

کیا یہ دانستہ طور پر، قرآن کریم کی ایک مخصوص آیت مبارکہ کو، اپنے نظریہ کی سند کے طور پر پیش کرنے کے لیے، اس میں معنوی تحریف نہیں کہلائے گی؟

اس آیت مبارکہ میں موجود لفظ" ملکت "میم، لام، قاف۔ پر زبر کے ساتھ، کیا فعل ماضی کا پتہ نہیں دے رہی؟ عربی گرامر جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ یہ آج کی کسی ملکیت کی بات نہیں ہو رہی۔ یہ ایمان لانے کے زمانے کے دور کی ملکیت کی بات ہو رہی ہے۔

چنانچہ اس آیت مبارکہ سے کسی طرح بھی انسانوں میں کسب معاش کی صلاحیتوں میں تفریق کی بات ثابت نہیں ہوتی ۔بلکہ انسانوں میں بعض، کو بعض پر معاشی برتری کی بات ہے۔

اب آتے ہیں دوسری آیت مبارکہ کی طرف۔ فرمایا

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۴۳:۳۲)

اچھا، تو گویا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نبوت جیسی چیز بھی، جو خالصتاً خدا کی رحمت اور موھیت ہے، ان کے معیار کے مطابق بانٹی جایا کرے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نبوت تو بہت بڑی چیز ہے، دنیاوی زندگی کی معیشت بھی ان کے معیاروں کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی۔ اکتساب رزق کی بنیادی استعداد اور صلاحیت مختلف افراد میں، مختلف ہوتی ہے۔ اور اس ہی لیے، ہر ایک کی کمائی، میں فرق ہوتا ہے۔ استعدادوں کا یہ فرق، اس لیے رکھا گیا ہے کہ معاشرے میں مختلف کام ہوتے ہیں جن کے لیے، مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا اجتماعی کاروبار اس ہی طریق سے چلتا ہے۔ لیکن اس سے تکریم انسانیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو جب اکتساب رزق کی بنیادی صلاحیت و استعداد کی یہ کیفیت ہے کہ وہ افراد کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی، خدا کی عطا کردہ ہوتی ہے، تو نبوت جیسی موھبت عظمیٰ جو دنیاوی مال و متاع سے کہیں زیادہ بلند مرتبت ہے، لوگوں کے معیار کے مطابق کس طرح مل سکتی ھے۔ یہ خدا کی موھبت ہے جس کے لیے وہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق مناسب شخصیت کا انتخاب کرتا ہے (مفہوم القرآن از علامہ غلام احمد پرویز علیہ رحمہ)

سچ پوچھیں کہ اگر اس آیت مبارکہ کو پہلے سے طے شدہ کسی نظریہ کے بغیر، سادہ ذہن ہو کر، سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو معاش کا سارا فلسفہ اس میں آجاتا ہے۔ بخدا، قرآن کریم پر تفکر و تدبر کے میرے روزانہ کے معمول میں،

جب میں اس آیت مبارکہ پر پہنچا، تو مہینوں اس پر ہی کھڑا رہ گیا۔ کتنے حقائق کو بیان کر دینے والی یہ سادہ لیکن مفصل آیت مبارکہ، اور اس کا یہ استحصال۔

یعنی جس شئے کی یہ آیت مبارکہ مخالفت کر رہی ہے ، اس سے وہ ہی شئے آپ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں ۔ ذرا غور فرمائیں، بات تو تقسیم کی ہو رہی ہے۔ اس قانون خداوندی کا حوالہ ہے۔ قانون مشیت کا حوالہ ہے کہ کس طرح سے دنیا کے کاروبار نے چلنا ہے۔ کس طرح دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ یہ آیت مبارکہ تو، انسانوں کے فطری جذبوں کی کی عکاس ہے۔ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا احوال ہے۔ ایک دوسرے کے کام آنے کے جذبہ محرکہ کا بیان ہے۔ ایک کی دوسرے پر درجات کا بیان ہے۔

یہ آیت مبارکہ تو واضح انداز میں بیان کر رہی ہے کہ اللہ کی رحمتوں کی تقسیم انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ کے قانون اور ضابطوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی مشیت، اپنے بندوں کے اعمال کے نتیجہ میں ان کے درجات کا تعین کرتی ہے۔ ان کی معیشت کا فیصلہ کرتی ہے۔

اس طرح انسانوں کے طبقات وجود میں آتے ہیں۔ اور اس طرح ایک طبقہ دوسرے طبقے کا مددگار ہوتا ہے۔

اپنی اپنی محنت کے صلے میں کوئی، کچھ بن جاتا ہے۔ تو کوئی کچھ۔ کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے تو کوئی مزدور۔ کوئی بزنس مین بن جاتا ہے تو کوئی کارپینٹر۔ کوئی الیکٹریشن بن جاتا ہے تو کوئی استاد۔ اس طرح نظام ہائے حیات چلتا ہے۔ جہاں ہر کوئی اپنے اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کے معاوضہ کی بنیاد پر۔

آیئے اس آیت مبارکہ سے پہلے والی آیت پر غور کرتے ہیں۔ فرمایا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۴۳:۳۱)

اور کہنے لگے: یہ قرآن (مکّہ اور طائف کی) دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی (یعنی کسی وڈیرے، سردار اور مال دار) پر کیوں نہیں اتارا گیا، (طاہر القادری)

غور فرمائیں بات کیا ہورہی ہے۔ کہا کہ یہ قرآن اس محمد ﷺ پر کیسے نازل ہوگیا۔ اگر اللہ نے اپنی ہدایت بھیجنی تھی، تو کیوں نہیں ان صاحب حیثیت، بڑے مال دار لوگوں پر نازل کیا۔ غور فرمائیں، کیا یہ وہ ہی انداز فکر نہیں ہے جو آج بھی ہمارے معاشروں میں عام ہے۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ کہتے ہیں۔

جدے گھر دانے، اودے کملے وی سیانے

یعنی جن کے گھر مال ہو، جو مال دار ہوں، ان کے توپاگل بھی عقل مند ہوتے ہیں۔ ان کے نادان بچے بھی عقل و دانش کے مینار سمجھے جاتے ہیں۔

آج بھی ہمارے معاشروں میں یہ سوچ ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں آج بھی کامیابی، اور عقل و شعور کا پیمانہ، کسی کا مال دار ہونا ہے۔ جو جتنا مال و دولت کا مالک ہوتا ہے، وہ اتنا ہی کامیاب و کامران تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، اقوال زریں کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی نالائقیوں کو بھی عقل اور شعور کی معراج کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سوچ ہمیشہ سے موجود ہے، یہ ہی سوچ تھی جو مکہ کے لوگوں کو اس بات پر آنے نہیں دے رہی تھی، کہ اگر اللہ نے کوئی ہدایت بھیجنی ہی تھی، تو ان صاحب حیثیت، سرداران کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ ایک عام آدمی کو کیوں منتخب کیا۔

اس کے جواب میں اللہ کریم نے فرمایا کہ ہاں تمہارے یہاں کامیابی اور ناکامی کا معیار مال و دولت ہے۔ تمہارے نزدیک جو جتنا صاحب حیثیت ہوتا ہے، اتنا ہی دانش ور ہوتا ہے۔ عقل مند ہوتا ہے۔ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمہارا معیار ہے۔ ہمارا نہیں۔ ہمارے یہاں کامیابی و کامرانی کے پیمانے مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں، انسان کے اعمال کے نتیجہ میں ان کے درجات کا تعین ہوتا ہے۔

مال و دولت کی فراوانی اور تنگی، ہمارے قانون مشیت کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے دو طرح کے قوانین ہیں۔ ایک حصول رزق کا طبعی قانون ہے۔ اس قانون کے مطابق جو کوئی عمل کرتا ہے، ہم اس کے مطابق اسے عطا کر دیتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارے نزدیک مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

فرمایا۔

مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (١٧:١٨)

جو کوئی صرف دنیا کی خوشحالی (کی صورت میں اپنی محنت کا جلدی بدلہ) چاہتا ہے تو ہم اسی دنیا میں جسے چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں جلدی دے دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ بنا دی ہے جس میں وہ ملامت سنتا ہوا (رب کی رحمت سے) دھتکارا ہوا داخل ہو گا، (طاہر القادری)

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا (١٧:١٩)

اور جو شخص آخرت کا خواہش مند ہوا اور اس نے اس کے لئے اس کے لائق کوشش کی اور وہ مومن (بھی) ہے تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش مقبولیت پائے گی، (طاہر القادری)

كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (١٧:٢٠)

ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں ان (طالبانِ دنیا) کی بھی اور ان (طالبانِ آخرت) کی بھی (اے حبیبِ مکرّم! یہ سب کچھ) آپ کے رب کی عطا سے ہے، اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لئے) ممنوع اور بند نہیں ہے، (طاہر القادری)

انظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا (١٧:٢١)

دیکھئے ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے، اور یقیناً آخرت (دنیا کے مقابلہ میں) درجات کے لحاظ سے (بھی) بہت بڑی ہے اور فضیلت کے لحاظ سے (بھی) بہت بڑی ہے، (طاہر القادری)

اور جو کوئی ہمارے ان قوانین سے روگردانی کرے گا، اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی۔ فرمایا۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (٢٠:١٢٤)

اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لئے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے، (طاہر القادری)

یہ ہیں کشادگی و تنگی رزق کے طبعی قوانین۔

کہاان قوانین کے تحت عمل کرنے والوں کو اس کے مطابق صلہ مل جاتا ہے۔نہ کمی نہ بیشی۔ اور پھر ہم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کون مومن ہے اور کون کافر۔ جس نے جتنی جستجو کی اتنا صلہ۔

جس نے سو روپے کی محنت کی، اسے سو دے دیا۔ جس نے ہزار کی محنت کی، اسے ہزار دے دیا۔ کوئی ڈنڈی نہیں ماری جائے گی۔ خواہ مومن ہو یا کافر۔

لیکن کہا وہ لوگ جو ہمارے مقرر کردہ طبعی قوانین پر پورا پورا عمل کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ وہ ہمارے فرمابردار بھی ہوتے ہیں، مومن ہوتے ہیں۔ ہمارے حکم اور ہدایت پر ہمیشہ سرنگوں رہے ہیں۔ کہاان کے لیے ان کی محنت کے طبعی قانون کے مطابق صلے کی ساتھ، رزق بے حساب ہے۔ ان پر آسمانوں سے رزق برسنے لگتا ہے، اور زمین سے ابلنے لگتا ہے۔ فرمایا۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (٥:٦٦)

کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں ایسا کرتے تو اِن کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا اگر چہ اِن میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بد عمل ہے (ابوالاعلی مودودی)

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ (١٩:٤٢)

اللہ اپنے بندوں پر بڑا لطف و کرم فرمانے والا ہے، جسے چاہتا ہے رِزق و عطا سے نوازتا ہے اور وہ بڑی قوت والا بڑی عزّت والا ہے، (طاہر القادری)

مزید فرمایا۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (٢٢:٥٠)

پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزّت کی روزی (ابوالاعلی مودودی)

وہ اپنے عبد مومن کو کامیابی و کامرانی سے نوازتا ہے۔ ان پر احسان کرتا ہے۔ ان کو دوسروں کے مقابلے میں کامیاب

وکامران کر دیتا ہے۔ لیکن جو اس کی بتائی ہوئی ہدایت سے دور رہتے ہیں، ان کے رزق تنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ فرمایا۔

وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ ۖ لَوْلَا أَن مَّنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (۸۲:۲۸)

اور جو لوگ کل اس کے مقام و مرتبہ کی تمنا کر رہے تھے (اَز رہِ ندامت) کہنے لگے: کتنا عجیب ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرماتا اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ فرماتا ہے، اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ فرمایا ہوتا تو ہمیں (بھی) دھنسا دیتا، ہائے تعجب ہے! (اب معلوم ہوا) کہ کافر نجات نہیں پا سکتے، (طاہر القادری)

مزید فرمایا۔

اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ (۲۶:۱۳)

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ نپا تلا رزق دیتا ہے یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں (ابو الاعلیٰ مودودی)

مزید فرمایا۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (۳۰:۱۷)

بیشک آپ کا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرما دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، بیشک وہ اپنے بندوں (کے اعمال و احوال) کی خوب خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے، (طاہر القادری)

کہا یہ ہے ہمارے یہاں فراوانی و تنگی رزق کا قانون۔ اور اس طرح لوگوں میں مختلف درجات وجود میں آ جاتے ہیں۔ یہ درجات ایسے ہی نہیں مل جاتے۔ یہاں کوئی بے انصافی نہیں ہے۔ جس کے جیسے اعمال اس کا ویسا ہی درجہ۔ فرمایا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ (۱۳۲:۶)

اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے لحاظ سے درجات (مقرر) ہیں، اور آپ کا رب ان کاموں سے بے خبر نہیں جو وہ انجام دیتے ہیں،(طاہر القادری)

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶:۱۹)

اور لوگوں نے جیسے کام کئے ہوں گے ان کے مطابق سب کے درجے ہوں گے۔ غرض یہ ہے کہ ان کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان کا نقصان نہ کیا جائے(فتح محمد جالندہری)

وہ لوگ جو اپنے رب کے فرمابردار ہونگے۔ اس کے حکم کے سامنے سجدہ ریز ہوں گے۔ اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے سرنگوں کرنے والے ہوں گے۔ ان کے درجات بلند کر دیے جاتے ہیں۔ انھیں دوسروں پر فضیلت عطا کر دی جاتی ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور رزق کریم کا وعدہ ہے۔

یہ ہے اللہ کریم کا وہ قانون مشیت، جس کے تحت انسانوں میں بعض کو فراوانی رزق عطا ہو جاتی ہے، اور بعض تنگی رزق کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے اعمال کے نتیجہ میں انسانوں میں مختلف طبقات وجود میں آجاتے ہیں۔ کوئی آجر بن جاتا ہے۔ کوئی مزدور۔ کوئی اعلٰی عہدوں تک پہنچ جاتا ہے کوئی ماتحت۔ کوئی استاد بن جاتا ہے، کوئی شاگرد۔ کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے، تو کوئی کارپینٹر، کوئی الیکٹریشن بن جاتا ہے تو کوئی کارخانہ دار۔

لیکن کوئی ابدی طور پر نہ تو الیکٹریشن ہوتا ہے، نہ مزدور، نہ کارپینٹر ہوتا ہے، نہ کارخانہ دار ہر کسی کے سامنے ترقی کی راہیں بھی موجود ہیں، تو پستی کے امکانات بھی۔

ایک کارپینٹر اپنی جہد مسلسل سے، اپنے رب کے قوانین کی پابندی کر کے، ترقی کی منازل طے کرتا ہوا کارخانہ دار بن سکتا ہے۔ تو دوسری طرف ایک کارخانہ دار، مزید محنت سے دستبردار ہو کر، اپنے رب کے قانون کی خلاف ورزی کر کے، ایک مزدور سے بھی نیچے طبقے میں پہنچ سکتا ہے۔

یہ سب کچھ ہمارے روزمرہ کے مشاہدات ہیں۔ جو کسی سند کے محتاج نہیں۔

یہ عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ پیچھے والے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آگے والے پیچھے ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ سارے طبقات ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ اس طرح نظام حیات چلتا رہے گا۔

ایک ڈاکٹر کا کام، ایک الیکٹریشن نہیں کر سکتا۔ ایک کارپینٹر کا کام ایک وکیل نہیں کر سکتا۔ ایک انجنیئر کا کام، ایک پلمبر نہیں کر سکتا۔ ایک کارخانہ دار کا کام، ایک سوئپر نہیں کر سکتا۔ ان سب کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے۔ یہ احیتاج ہمیشہ قائم رہے گی۔ ایک کام کروانے والا، ایک کام کرنے والا، یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔

یہاں ایک ڈاکٹر ایک سوئپر کا علاج کر کے اپنا رزق حاصل کرے گا۔ ایک سوئپر ایک ڈاکٹر کو فیس دے کر اپنا علاج کروائے گا۔ ایک ڈاکٹر ایک سوئپر کو معاوضہ دے کر اپنی ضرورت پوری کرے گا۔ ایک سوئپر، اپنا معاوضہ لے کر دوسروں کے کام آئے گا۔ یہ ہی فطری جذبہ محرکہ ہے، ایک کا دوسرے کے کام آنے کا۔

کسی اور نام نہاد جذبہ محرکہ کی بنیاد پر کوئی کسی کی گندگی صاف نہیں کر سکتا۔ کوئی جون جولائی کی گرمیوں میں، گیارہ، بارہ منزلہ عمارت تک اینٹیں نہیں ڈھو سکتا۔ یہ تب ہی ہو گا، جب کام کرنے والے کو معاوضہ کی ضرورت ہو گی۔ اور کام کروانے والے کے پاس معاوضہ ادا کرنے کی حیثیت ہو گی۔

غور فرمائیں دوستو۔

کیسی عظیم حقائق کو بیان کر دینے والی اس آیت مبارکہ کا کس طرح استحصال کیا گیا ہے۔ جس شئے کو یہ آیت مبارکہ مسترد کرتی ہے، اس ہی کو اس آیت سے ثابت کرنے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔

## حاصل کلام

آپ انسانی زندگی کی لازمی ضروریات پر غور فرمائیں۔ دو وقت کی روٹی، پہننے کے لیے کپڑے، رہنے کے لیے مکان، علاج اور تعلیم۔ یہ ہی تو ہیں۔ اب اگر ہم ان ضروریات کی کلاسیفکیشن کریں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک

جھونپڑی میں بھی گزارلیتاہے۔۔پہاڑ کے غاروں میں بھی رہ لیتاہے۔۔ایک جوڑا کپڑے میں بھی، ایک دو سال نکال لیتاہے۔بغیر تعلیم اور علاج کے بھی زندہ رہ لیتاہے۔لیکن جو احتیاج اسے روزانہ پریشان کیے رہتی ہے، وہ دو وقت کی روٹی ہے۔

انسان کی زندگی کی یہ ضرورت، اس کے روز کا مسئلہ ہے۔جس سے مفر ممکن نہیں۔جس پر کوئی سمجھوتہ نہیں۔ہر انسان کو روزانہ، کم از کم دو وقت کی روٹی لازم چاہیے۔یہ ہی وجہ ہے کہ انسانی ضروریات میں سے صرف اور صرف اس اہم ضرورت، یعنی بھوک کو ہی اللہ رب کریم نے حالت اضطرار کے زمرے میں تسلیم کیاہے۔اور اس ہی لیے، اس نے حالت اضطرار میں، ان اشیاء کو استعمال کر لینے کی اجازت دی ہے، جو عام حالت میں حرام قرار دی گئی ہیں۔

آپ پورے قرآن پر نظر دوڑائیں۔آپ دیکھیں گے کہ وہ خدا، معاشرے کے ان صاحب حیثیت افراد کو جن کے پاس رزق کی فراوانی ہے، معاشرے کے ان بھوکے لوگوں کی بھوک کا بندوبست کرنے کا حکم دیتاہے۔وہ ان لوگوں کو حکم دیتاہے کہ تمہیں کچھ ایسا انتظام کرنا ہو گا کہ تمہارے معاشرے میں، انسان کی کم از کم لازمی ضرورت پوری ہوتی رہیں۔

معاشرے کے یہ لوگ جن کے پاس رزق کی فراوانی ہے، کیا یہ قابل نفرت لوگ ہیں؟

کیا یہ ظالم اور جابر لوگوں کا کوئی گروہ ہے؟

کیا یہ دنیا میں ساری ناہمواریوں کے ذمہ دار لوگ ہیں؟

کیا معاشرے میں موجود یہ لوگ، سارے کے سارے لٹیرے، انسانوں کا استحصال کرنے والے، لوگوں کا خون چوسنے والے، دوسروں کی کمائی پر غاصبانہ تسلط جمانے والے، مستبد اور بے رحم لوگوں کا کوئی جتھا ہے؟

سوال یہ ہے کہ معاشرے میں یہ لوگ کس طرح وجود میں آجاتے ہیں؟ان کو فراوانی رزق کس طرح حاصل ہو جاتی ہے؟

کیا یہ محض اتفاقات کا کھیل ہے؟یا یہ سب کچھ اس رب کریم و حکیم کے قانون کے مطابق ہے؟

دوستو۔۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵:۲۲)

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق (پر مبنی حکمت) کے ساتھ پیدا فرمایا اور اس لئے کہ ہر جان کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کمائے ہیں اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا،(طاہر القادری)

کہا کہ یہ جو ارض و سماوات ہیں، ہم نے انھیں بالحق تخلیق کیا اور انھیں گردشیں دیتے ہیں، تاکہ ہر نفس کے عمل کا پورا پورا نتیجہ برآمد ہو، اور کسی کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہو۔

کائنات کے اس نظام کا تو ہم خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ گردش لیل و نہار، کس طرح انسان کے طبعی معاملات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کس طرح سورج کی روشنی، فصل کو اگانے کے لیے لازم ہے۔ کس طرح چاند کی کرنیں سمندر میں جوار بھاٹا پیدا کرتی ہیں۔ کس طرح دن اور رات کے آنے جانے سے انسان کی زندگی پر اثر ہوتا ہے۔

لیکن انسان کی زندگی، صرف اس کے طبعی تقاضوں ہی پر تو مشتمل نہیں ہوتی۔ انسان تو ان طبعی جسم کے علاوہ بھی ایک شئے کا مالک ہے جسے قرآن نفس کہتا ہے۔ انسان کی وہ حیثیت جو اس انسانی جسم کے ختم ہو جانے کے بعد بھی آگے چلے گی۔

انسانی نفس اور اسکے اعمال پر یہ گردش لیل و نہار کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں، علم نفسیات کے ماہرین ہنوز اس کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ انسان کی کوئی کوشش، خواہ وہ ان طبعی قوانین کے دائرے میں آتی ہو، یا اس دائرے میں آتی ہو، جسے ہم نفس، روح، یا انسانی ذات کہتے ہیں، خالق کائنات نے اس کے عمل کے پورے پورے نتیجے کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ انسان کا کوئی عمل، بغیر نتیجہ کے نہیں رہ سکتا۔

توکیا فراوانی رزق، کامیابی، کامرانی، ترقی و خوشحالی، آسودگی، کے لیے کوئی قانون نہیں؟ کیا یہ تمام باتیں ان گردش لیل و نہار کے آسمانی انتظام سے باہر کی باتیں ہیں؟ اور پھر دوسری طرف بھوک، تنگ، افلاس، یہ سب بھی اس خالق کائنات کے مقرر کردہ کسی قانون کے تابع ہوتے ہیں، یا محض، کسی فرد، گروہ یا قوم کی ناانصافی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں؟

قرآن انسان کے معاشی معاملات کے حوالے سے دو طرح کے قوانین کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ ایک حصول رزق کا طبعی قانون ہے۔ جس میں مومن اور کافر کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جس طرح آگ اس بات کو نہیں دیکھتی کہ اس کی زد میں کوئی گناہ گار آرہا ہے، یا کوئی معصوم بچہ۔ اس ہی طرح اللہ کریم کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، جو کوئی بھی حصول رزق کی کوشش کرے گا اسے اس کی پوری جزاء ملے گی۔

اللہ کریم کے مقرر کردہ طبعی قوانین کے مطابق، جو بھی کوشش کرے گا۔ اس کے نتائج بھی اس قانون کے مطابق بر آمد ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کافر طبعی قوانین کے مطابق کوشش کرے، تو اس کی کوششوں کا ثمر اسے اس وجہ سے نہ ملے کہ وہ کافر ہے۔ یہ بات انصاف کے اصول ہی کے خلاف ہے۔

چنانچہ کشادگی و فراوانی رزق کے خدائی قانون کے مطابق، عمل کے نتیجہ میں اس کے مقررہ ثمرات انسان کو لازماً مل جاتے ہیں۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تخصیص نہیں۔

ممکن ہے کہ اس طرح فراوانی و کشادگی حاصل کرنے والا انسان، ظلم و استبداد کا مرتکب ہو۔ معاشرے میں ناہمواریوں کا سبب بنے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ زیادتی کرے۔ لیکن اللہ کریم کے قانون مکافات عمل کی رو سے ایسے عمل کے منفی نتائج سے زیادہ دیر بچ نہیں سکتے۔ اور باالآخر، تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جو اللہ کریم کے ان طبعی قوانین کا اتباع بھی کرتے ہیں جو کامیابی، کامرانی، کشادو فراوانی لاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ مومن ہوتے ہیں۔ اللہ کریم کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے ہوتے ہیں۔ اپنے رب کی عطا کی ہوئی نعمتوں اور کرم نوازیوں پر اسکے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو، اللہ کریم اس طبعی قانون سے کہیں زیادہ عطا فرما دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں جابجا، ان لوگوں کے لیے، جو ایمان لائے، نیک اعمال کئے، اور اپنے رب کے ہر حکم کے آگے سر جھکاتے رہے، ان کے لیے دنیا و آخرت کی خوشگواریوں، کامیابیوں، کامرانیوں، رزق کریم، اور بے حساب رزق کا وعدہ ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۸:۲)

ایمان والے وہی ہیں جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب اس کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (احمد علی)

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۸:۳)

وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (احمد علی)

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸:۴)

یہی سچے ایمان والے ہیں ان کے رب کے ہاں ان کے لیے درجے ہیں اور بخشش ہے اور عزت کا رزق ہے (احمد علی)

مزید فرمایا۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (۵:۶۶)

کاش انہوں نے توراۃ اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں ایسا کرتے تو اِن کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا اگرچہ اِن میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بد عمل ہے (ابوالاعلی مودودی)

ایمان اور عمل صالحہ کا نتیجہ دنیا میں فراوانی رزق اور آخرت میں جنت ہے۔ وہ رب اپنے حکم کے تابع بندوں کو مسلسل فراوانی رزق کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اپنی اس عطا میں وہ کسی حساب کتاب کا قائل بھی نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۙ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (۲۴:۳۷)

اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی (ابوالاعلی مودودی)

لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۴:۳۸)

(اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے (ابو الاعلی مودودی)

آیت بالا کے آخری الفاظ پر آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔ کہا کہ اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق، بے حساب رزق دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے والی آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ انسان اللہ کریم کے مقررہ قانون کے مطابق جب کوششیں کرتا ہے، تو اسے اس کی کوششوں کے ثمرات مل جاتے ہیں۔ اور اس میں کافر یا مومن کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اور بات یہ ہے بھی انصاف کی۔ کہ جو جتنی محنت کرے اسے اس کے مطابق مل جانا چاہیے۔ لیکن اگر اللہ کا ایک محکوم، عبد، اپنے رب کے حکم کے مطابق، اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے حکم کی تابعداری میں اپنی عمر بتاتا ہے، تو اس طبعی قانون رزق کے مطابق ملنے والا، نپا تلا رزق، رزق بے حساب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر نہ تو انسان کی کسی ہنر مندی کا کوئی دخل ہے، اور نہ ہی کسی صلاحیت کا۔ یہاں تو بس عطا ہی عطا ہے۔ کرم ہی کرم ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہ رب کہتا ہے کہ مومن کبھی محکوم نہیں ہو سکتا۔ مغلوب نہیں ہو سکتا۔ یہ ہی وہ رزق کریم ہے جس کی دعا حضرت ابراھیم علیہ سلام نے کی۔ فرمایا۔

رَّبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (۱۴:۳۷)

اے ہمارے رب! بیشک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل علیہ السلام) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم رکھیں پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ شوق و محبت کے ساتھ ان کی طرف مائل رہیں اور انہیں (ہر طرح کے) پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکر بجالاتے رہیں،

ایسی ہی دعا حضرت عیسیٰ علیہ سلام نے فرمائی۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۵:۱۱۴)

عیسٰی ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے خوانِ (نعمت) نازل فرما دے کہ (اس کے اترنے کا دن) ہمارے لئے عید ہو جائے ہمارے اگلوں کے لئے (بھی) اور ہمارے پچھلوں کے لئے (بھی) اور (وہ خوان) تیری طرف سے نشانی ہو، اور ہمیں رزق عطا کر اور تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے،

(طاہر القادری)

دوستو۔ قرآن کریم میں اس حوالے سے اتنا کچھ موجود ہے کہ اگر میں لکھنا شروع کر دوں تو، کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مضمون کی طوالت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہی۔

چنانچہ فراوانی وکشادگی رزق، اللہ کریم کی عطا ہے۔ اس کا کرم ہے۔ اس کی عنایت ہے۔ وہ اپنے عبد پر اس ہی طرح مہربان ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں کی طرف لے جاتا ہے۔ مومن کی زندگی کبھی عسرت کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ کبھی ناداری کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ وقتی حوادث زمانہ، مخالفین کی ریشہ دوانیاں، الگ بات ہے لیکن مستقل بھوک، افلاس، تنگی، حقیقتاً عذاب خداوندی ہے۔ اس کی لعنت ہے۔ فرمایا

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶:۱۱۲)

اور اللہ نے ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جو (بڑے) امن اور اطمینان سے (آباد) تھی اس کا رزق اس کے (مکینوں کے) پاس ہر طرف سے بڑی وسعت و فراغت کے ساتھ آتا تھا پھر اس بستی (والوں) نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا لباس پہنا دیا ان اعمال کے سبب سے جو وہ کرتے تھے،

(طاہر القادری)

وہ خدا، تنگی رزق، کو اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ فرمایا۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰:۱۲۴)
اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لئے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے، (طاہر القادری)

غور فرمائیں۔ تنگی رزق، تو اللہ کا عذاب ہے۔ چاہے وہ انفرادی ہو، یا اجتماعی۔ وقتی حادثات سے کسی طرح کی پریشانی، اور تنگی ایک دوسری بات ہے۔ یہ انسانوں کو اپنی نشو و نما کے حقیقی ادراک کے لئے ایک ٹیسٹ ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (۲:۱۵۵)
اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں، (طاہر القادری)
الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۲:۱۵۶)
جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں: بیشک ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں، (طاہر القادری)
أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲:۱۵۷)
یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے پے در پے نوازشیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں، (طاہر القادری)

لیکن مستقل بھوک، افلاس، ناداری۔ یہ سب تو عذاب خداوندی ہے۔ اور اگر کوئی فرد یا قوم اس عذاب خداوندی کا شکار ہو جائے، تو اس کے لیے تو اس اللہ کریم کے یہاں بھی کوئی جگہ نہیں، کوئی معافی نہیں، یہاں تک کہ وہ توبہ کرے، اپنی روش زندگی کو تبدیل کرے، اپنی اصلاح کرے۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرے۔

دوستو۔ آیات بالا سے جو صورتحال ہمارے سامنے آتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

کہ معاشرے میں ایک طبقہ وہ ہو گا، جو حصول رزق کے طبعی قانون کے تحت، فراوانی رزق کا مالک ہو گا۔ چونکہ اس طبقہ کا مطمع نظر صرف اور صرف مفاد عاجلہ ہو گا، یہ دنیا ہو گی۔ جس کا آخرت پر ایمان نہیں ہو گا۔ چنانچہ یہ لوگ دوسرے انسانوں پر ظلم اور استبداد بھی کر سکتے ہیں۔ لوگوں کا حق بھی مار سکتے ہیں۔

ایسے لوگ ایک طرف اللہ کریم کے قانون مکافات عمل کی زد میں ہوں گے، تو دوسری طرف عام آدمی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے خلاف آواز بلند کرنی ہو گی۔ ان کے ظلم کو روکنا ہو گا۔

یہاں مجھے آقائے نامدار محمد ﷺ، کے وہ حدیث مبارکہ یاد آگئی، جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔ کہا مظلوم کی مدد کرو۔ ساتھ ہی ظالم کی بھی۔ صحابہ نے حیرانی سے پوچھا۔ یارسول اللہ۔ مظلوم کی مدد تو سمجھ آتی ہے۔ یہ ظالم کی مدد کیا ہے؟ فرمایا۔ اسے ظلم سے روک دو۔ تاکہ وہ جہنم میں جانے سے بچ جائے۔ یہ ہی اس کی مدد ہو گی۔

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے، بغاوت نہیں کرتا

دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے، جو اپنے رب کے فرمابردار، بندے ہوں گے۔ جو ہر لمحہ اپنے رب کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ جو کامیابی و کامرانی، کشائش رزق کے طبعی قانون پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ، اپنے رب سے رزق کریم کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوں گے۔ جو اپنے رب سے رزق بے حساب کے طلب گار ہوں۔ ان پر اللہ کریم کی نعمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہر لحاظ سے خوشحال و مطمئن ہوں گے۔

لیکن معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ جو اپنی کسی معذوری کے باعث، اپنی روٹی خود نہیں کما سکتے۔ یا ایسے لوگ، جو خوددار ہوتے ہیں۔ لیکن کسی وقتی حادثہ کی وجہ سے رزق کمانے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ یہ معذوری جسمانی

بھی ہو سکتی ہے اور زمانے کے اتار چڑھاو کا نتیجہ بھی۔ جن کے چلتے ہوئے کاروبار، کسی وقتی حادثہ یا انسانی کوتاہی و غلطی سے رک گئے ہوں۔ جو دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلا سکتے ہوں۔

دوستو۔ پورے قرآن کو پڑھ ڈالیں۔ بار بار پڑھیں۔ اس پر تفکر و تدبر کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان صاحب حیثیت انسانوں کو، ان مجبور، مشکل میں گرفتار سفید پوش لوگوں کی روٹی کے بندوبست کا حکم دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی داد رسی کا حکم دیا گیا ہے۔

آپ خود اس بات پر غور فرمائیں۔ کیا خدا ہمیں ان لوگوں کی امداد کا حکم دے سکتا ہے، جو اپنے اعمال کی بدولت، عذاب خداوندی میں گرفتار ہوں؟

کیا یہ بات کسی طرح سے بھی قابل فہم ہو سکتی ہے کہ اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب لوگوں کو، گھر بیٹھے روتی پہنچانے کا حکم دیا جائے؟

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے پاس تو صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ کہ اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ اپنے اعمال کو درست کریں۔ ان کوتاہیوں سے باز آجائیں جس کا نتیجہ تنگی رزق ہے۔ اور اپنے رب کے ان قوانین پر عمل پیرا ہوں، جس کا لازمی نتیجہ فراوانی و کشائش رزق ہے۔

اگر یہ لوگ ایسا نہیں کریں گے ، تو دنیا کی کوئی بھی طاقت ، ان کے غربت اور افلاس کو دور نہیں کر سکتی ۔ قرآن کریم میں کہیں بھی، لوگوں کی غربت کو دور کرنے کے لیے صاحب حیثیت لوگوں کا مال و متاع چھیننے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ وہ انسانوں کی ترقی کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی کا حکم دیتا ہے۔

وہ معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی بنیاد پر ایسے نظام کی تشکیل کا حکم دیتا ہے جس میں ہر انسان کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق، ترقی کرنے کے یکساں مواقع دستیاب ہوں۔

ایسا نظام جو دوسروں کی نشو و نما کے لیے راہیں کھلی رکھنے کی ضمانت ہو۔ ایسا نظام، جس میں زندہ رہنے کی خواہش رکھنے والے کو زندہ رہنے کا حق ملے۔ جہاں محنت کرنے والوں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ ملے۔

اس مقصد کے لئے وہ "انفاق" کا حکم دیتا ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو اپنی محنت کا ماحصل، دوسرے انسانوں کے لیے کھلا رکھنے کا حکم دیتا ہے، تا کہ پیچھے آنے والوں کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع میسر آئیں۔

یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اگر کوئی آج غریب ہے تو کل اپنے رب کے حکم کے مطابق، اس کے قانون کی پیروی کر کے کشادگی رزق کا مالک بن جائے گا۔ اپنے ہاتھوں کی محنت سے۔ نہ کہ کسی دوسرے انسان کی کمائی سے۔
لیکن دوسری طرف یہ نظام ایسے نکمے، نکھٹو، مترفین کو پالنے سے روک دے گا، جو دوسروں کی محنت پر اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ جو دوسروں کی محنت پر، قوم اور مذہب کے نام پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مترفین کو پالنا، قہر خداوندی کو آواز دینا ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (١٧:١٦)

قوموں کی تباہی کے لیے خدا کا قانون یہ ہے، کہ جب وہ آرام پسند، محنت کیے بغیر، زیادہ سے زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کی خواہشمند عیش پرست اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حامل ہو جاتی ہے، اور اس طرح اس صحیح راستے کو چھوڑ کر جو ان کے سامنے واضح طور پر آچکا ہوتا ہے غلط راستوں کو اختیار کر لیتی ہیں، تو وہ تباہی کی مستوجب ہو جاتی ہیں، اور پھر انھیں اس طرح ہلاک کر دیا جاتا ہے کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔
(مفہوم القرآن از جناب غلام احمد پرویز رح)

اس ہی کے ساتھ یہ نظام معاشرے میں موجود ان نادار اور کمزور لوگوں کی دادرسی کا انتظام بھی کرے گا، جو اپنی کسی جسمانی یا ذہنی معذوری کی وجہ سے، یا کسی وقتی حادثہ کی وجہ سے، اپنی روٹی پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ معاشرے کا وہ طبقہ ہے جسے قرآن، سائل و محروم کہتا ہے۔
یہ نظام ان سائلین و محرومین کو عزت نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرے گا۔ ان کی فوری ضروریات یعنی کھانے پینے کا بندوبست بھی کرے گا، تو دوسری جانب ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے اقدامات بھی اٹھائے گا تا کہ رفتہ رفتہ یہ لوگ بھی اپنے ہاتھوں سے اپنی روٹی پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے قرآن مومنین کو "زکوٰۃ" کا حکم دیتا ہے۔

یہ سارے کام مسلسل چلتے رہیں گے، ہمیشہ سے چلتے چلے آرہے ہیں، چلتے چلے جائیں گے۔ ایک فرد سے ایک خاندان، ایک خاندان سے ایک بستی ، ایک بستی سے ایک قوم ، ایک قوم سے پوری نوع انسانی ۔ ایک گریڈ سے دوسرے گریڈ میں تبدیلی۔ کوئی سی گریڈ سے بی گریڈ میں ترقی کرے گا۔ کوئی اے گریڈ سے بی گریڈ میں تنزلی کا شکار ہو گا۔ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ اس طرح انسان مختلف طبقات میں اپنے اپنے حصے کا کام کرتا رہے گا۔

اس سے اس کی نشو ونما ہوگی۔ اس کی ذات کی نشو ونما ہوگی۔ جو اسے اس دنیا کے بعد والی دنیا کے مدارج طے کرنے کے قابل بنائے گی۔ اور یہ طبقات تو جنت میں بھی ختم نہیں ہوں گے۔ وہاں بھی اللہ کریم انسانوں کے اعمال کے نتیجہ میں بلند اور بلند اور بلند درجات کا پتہ دیتے ہیں۔ اس ہی طرح جہنم میں بھی۔ اس ہی لیے فرمایا کہ منافق، جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے۔

اگر انسانوں کے درمیان یہ طبقات ختم ہو جائیں، تو انسان کی نشو ونما ہی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ کتنے خوبصورت انداز میں قرآن نے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے۔

فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (٦:١٦٥)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اسی میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے (ابوالاعلیٰ مودودی)

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کیجئے

# زکوٰۃ

دوستو۔ دین انسان کی زندگی کے ہر مسئلے کے حل کا نام ہے۔ دین انسان کو ان کٹھنائیوں سے بچاتا ہے، جن سے گذر کر، ایک طویل سفر کے بعد، انسان کچھ سیکھتا ہے۔ وحی خداوندی روز اول سے انسان کو اس راستے کی راہنمائی فراہم کرتی ہے جو انسان کے فہم وادراک سے بالا ہوتے ہیں۔ جنہیں حل کرنے میں اسے صدیوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔
دنیا میں کوئی معاشرہ پہلے دن سے وجود میں نہیں آتا۔ یہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ چنانچہ دین کے ہر حکم کی ابتداء ایک فرد سے ہوتی ہے، پھر ایک سے دو، اور دو سے تین۔ اس طرح ایک جماعت، ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ مختلف افراد پر مشتمل یہ معاشرہ ان ہی خواص کا مظہر ہوتا ہے، جو فرد میں ہوتی ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی معاشرے کے لوگ، انفرادی طور پر مجرمانہ خیالات و نظریات کے مالک ہوں، لیکن وہ معاشرہ نیک اور پارسا ہو۔
دین اپنے پیروکاروں کی انفرادی تربیت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی ابتداء ایک انسان کو وحی خداوندی کے ذریعے، علم یقین عطا فرما کر کی جاتی ہے۔ اس انسان کو خدا، نبی ورسول کہتا ہے۔ یہ اپنے دور کا بہترین انسان ہوتا ہے۔ اس انسان کو وحی کی روشنی عطا فرما کر، اپنے جیسے لوگوں کی انفرادی تربیت کا حکم ملتا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہ سلام، اپنے رب کا پیغام، اپنے لوگوں تک انفرادی سطح پر پہنچانے کا انتظام کرتے تھے۔ وہ وحی ربی کو من و عن، اپنے لوگوں تک پہنچاتے تھے، اور پھر اس وحی خداوندی کے مطابق لوگوں کے انفرادی کردار کی تعمیر کرتے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ، اپنے ہم خیال لوگوں کی تعداد میں اضافہ کرکے، ایک نیا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس عمل کو عربی زبان میں "تزمیل" کہتے ہیں۔ اس ہی نسبت سے حضور اکرم ﷺ کو اللہ کریم نے "مزمل" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

دین کا کوئی حکم، ہدایت، راہنمائی، کسی بھی مخصوص وقت، جگہ یا حالات کے ماتحت نہیں ہوتے۔ وہ تو روز اول سے اپنے پیروکاروں پر نافذ العمل ہوتے ہیں۔ دین کے پیروکار انفرادی سطح پر ان احکامات و ہدایات پر اپنے دل کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے، جو ان احکامات ربانی کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔

جس طرح دین انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت و راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس ہی طرح، یہ انسانوں کے سب سے بڑے مسئلہ یعنی اس کے معاش کے ضمن میں بھی مکمل ہدایات و راہنمائی عطا کرتا ہے۔ اپنے طے کئے ہوئے قانون مشیت کے مطابق وہ جانتا ہے کہ انسان اپنی کاوشوں اور حکم ربانی پر عمل پیرا ہو کر، معاشی میدان میں مختلف طبقات میں تقسیم ہو جائے گا۔ کچھ فراوانی رزق کے مالک ہوں گے، تو کچھ کم کے۔ کچھ لوگ، معاشی لحاظ سے اپنے ہم عصر لوگوں سے زیادہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ اور کچھ لوگ، ان کامیاب و کامران لوگوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ اپنے ان ماننے والوں کو، جو اپنی محنت، جدوجہد، اور سعی مسلسل کے نتیجہ میں کامیابی و کامرانی کے بلند مقام پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں، اپنی محنت کے ماحاصل سے "انفاق" کا حکم دیتا ہے۔

وہ اپنے ان ماننے والوں کو اس بات کا حکم دیتا ہے، کہ تم اپنی محنت کے حاصل کو ایک جگہ منجمد نہ کر دینا۔ بلکہ اپنی کامیابیوں کو، خواہ وہ مالی ہو، علمی ہو، جسمانی و ذہنی طاقت ہو، تسخیر کائنات ہو، یا دیگر سہولیات زندگی۔ ان سب کو اپنے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کی نشوونما میں آسانی پیدا کرنے کے لیے، کھلا رکھو۔ اپنی محنت کے حاصل کو معاشرے کی تعمیر و ترقی کے عمل کو جاری و ساری رکھنے کے لیے استعمال کرو، تاکہ معاشرے کے وہ لوگ جو مسابقت کے عمل کی وجہ سے تم سے پیچھے رہ گئے ہیں، وہ بھی اپنے رب کے احکامات پر عمل کر کے، اور تمہاری معاونت سے زیادہ ترقی کر سکیں، تاکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی زیادہ خوشحال ہوتا چلا جائے۔ چونکہ مسابقت کا عمل بھی مسلسل جاری و ساری رہے گا، تو اس ہی طرح "انفاق" کا عمل بھی جاری و ساری رہے گا۔

چنانچہ ایک طرف قرآن اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی روٹی آپ پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ رزق کریم کا درس دیتا ہے۔ تو دوسری جانب معاشرے کے وہ لوگ، جو کسی جسمانی یا ذہنی معذوری کی وجہ سے اپنا رزق آپ پیدا کرنے

سے قاصر ہوتے ہیں، یا، وہ لوگ کہ جو کسی وقتی حادثہ کے نتیجہ میں فوری طور پر رزق کمانے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کے لیے، ان کے بچوں کے لیے، روٹی تعلیم، علاج، رہائش وغیرہ کا باعزت بندوبست کرنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے ایک ایسا نظام جس میں معاشرے کے یہ نادار لوگ، عزت نفس کے ساتھ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی عزت اور سہولت کے ساتھ گزار سکیں۔ معاشی مجبوریاں ان کی زندگی کی نشو و نما کے آئندہ مراحل میں رکاوٹ نہ بنیں۔ قرآن اسے "ایتائے زکوٰۃ" کہتا ہے۔ وہ معاشرے کے ان صاحب حیثیت لوگوں کو جو دین پر عمل کرتے ہیں، اپنے رب کے فرمابردار ہیں، معاشرے کے ان نادار لوگوں کی "ایتائے زکوٰۃ" کے ذریعے امداد کا حکم دیتا ہے۔

عربی زبان میں "زکوٰۃ" کا معانی۔ نشو و نما۔ بالیدگی۔ پھولنا پھلنا۔ وغیرہ ہیں (تاج العروس)۔ نیز اس کے معانی پاکیزگی کے بھی ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ پاکیزگی کے بجائے، نشو و نما کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۲:۲۳۲)

تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے

(ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

آیت بالا میں، دونوں الفاظ، "زکو" اور "طہر" کو ایک ساتھ بیان فرما کر، ان دونوں کے مختلف معانی کو واضح کر دیا گیا ہے۔

"الزکی" خیر وخوبی کے ساتھ بڑھنے والا، عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا ہے

(صاحب محیط بحوالہ بیضاویؒ)

اس کے بنیادی معنوں میں، ارتقاء، اور بالیدگی دونوں آجاتے ہیں۔

چنانچہ "ایتائے زکوٰۃ" ایک ایسے نظام کا نام ہے جو معاشرے کے ان لوگوں کو، جن کی صلاحیتیں، کسی وجہ سے نشو و نما نہ پا رہی ہوں انہیں ایسے مواقع بہم پہنچانا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرے کا ہر فرد، اپنی صلاحیتوں کی جلا کر سکے، معاشرے کا فعال رکن بن سکے، معاشرے کی ترقی وخوشحالی میں اپنا حصہ ڈال سکے۔

انسانی صلاحیتوں کی جلا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، فکر معاش ہے۔ بھوکا انسان کسی بھی طرح کے تعمیری کام کا سزاوار ہو ہی نہیں سکتا۔ خالی پیٹ چودھویں کا خوبصورت چاند، ایک روٹی کی مانند نظر آتا ہے۔ چنانچہ قرآن ان نادار لوگوں کی روٹی کے بندوبست کا حکم دیتا ہے۔ وہ ان صاحب حیثیت افراد کو آگاہ کرتا ہے کہ معاشرے کے یہ محروم و نادار لوگ، تمہاری ذمہ داری ہیں۔ ان محروم لوگوں کا تمہارے مال میں ایک متعین حق ہے، جو تم نے لازماً ادا کرنا ہے قرآن کریم میں اس حوالے سے کوئی ابہام نہیں ہے، کہ معاشرے کے ہر اس فرد کو یہ فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ اس حوالے سے اتنی زیادہ آیات قرآنی موجود ہیں کہ اگر میں ان کو لکھنے بیٹھ جاؤں تو کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔۔ لیکن اس موضوع پر اپنا نقطہ نظر بیان کرنے سے قبل میں چاہوں گا، کہ ایک اور نقطہ نظر آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ، اس موضوع پر لکھتے ہیں۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۲۲:۴۱)

یہ ہی لوگ ہیں، کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہو گا، تو یہ صلوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، اور نوع انسانی کی پرورش کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

"اس آیت میں ایک دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ "ایتائے زکوٰۃ" (زکوٰۃ دینے) کا فریضہ اس وقت ادا ہو سکے گا جب ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے سے مراد خیرات دینا ہو، تو اس کے لیے اپنی حکومت کی ضرورت نہیں۔ خیرات تو ہر حکومت کے تابع دی جا سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "ایتائے زکوٰۃ" سے مراد خیرات دینا نہیں، اس سے مراد ایسا نظام حکومت قائم کرنا ہے، جس کا مقصد نوع انسانی کے لیے سامان نشو و نما مہیا کرنا ہو"۔

"اور دوسری غور طلب بات یہ ہے، کہ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے، کہ اسلامی مملکت زکوٰۃ دے گی، (اس حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہو گا) لہٰذا یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے، کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے، کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ کا پیسہ وصول کرے، یہ تصور قرآن کے تصور زکوٰۃ کے خلاف ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے، کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ" دینا ہے، نہ کہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا"۔

نظام ربوبیت، صفحہ نمبر 151، 152۔۔۔ از علامہ غلام احمد پرویزؒ

یہ بات اس سے پہلے بھی اکثر کرتا چلا آرہا ہوں، کہ جس دور میں قرآنی فکر کے نامور علماء کرام ہمارے سامنے آئے، جنہوں نے قرآن کریم کو اس کی اصل تعلیم کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی، وہ سوشلزم کے عروج کا زمانہ تھا۔ اور عین انسانی فطرت کے مطابق، اپنے وقت کے کچھ مخصوص رجحانات سے متاثر ہو جانا، بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سوشلزم کا ایک بظاہر خوبصورت، مگر مکروہ نظریہ کہ "کماؤ صلاحیت کے مطابق، خرچ کرو ضرورت کے مطابق"۔ اور اس کو بنیاد بنا کر لوگوں سے ان کا مال و متاع چھین لو۔ کسی کے پاس کچھ نہ رہنے دو۔ سب کو کنگال کر دو، سوائے اس گروہ کے جو دین کا نام لے کر آپ پر مسلط ہو جائے۔ جو بزعم خود اس معاشرے میں واحد ہی دیندار اللہ کے پیارے، دین کے ٹھیکدار ہونے کے دعوے کے ساتھ آپ کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دے۔ تو پھر دین کے اس انقلابی اور بنیادی رکن کا یہ ہی مفہوم بیان کیا جانا چاہیے تھا۔ ورنہ سارا نظریہ ہی باطل ہو جاتا۔

جب "انفاق" کا معنی لوگوں سے ان کا سارا مال، جائیداد، گھر، کاروبار بزور تعزیر چھین لینا کیا جائے، تو پھر ان لوگوں کو جن سے ان کا سب کچھ چھین لیا جائے، روٹی کے چند ٹکڑے تو دینے ہی ہوں گے۔ تو اب ایک گروہ پہلے اللہ کے نام پر حکومت قائم کرے، لوگوں سے ان کا سارے کا سارا مال و متاع بزور طاقت چھین لے، پھر انہیں لائن میں لگا کر چند ٹکڑے روٹی کے دے کر، ان پر حکومت کرے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ تو مجھے بتایا جائے، کہ سوشلزم نے اور کیا کیا تھا۔ یہ ہی تو کیا تھا نہ؟

سب سے پہلے تو اس آیت مبارکہ پر غور فرمائیں۔ میں نہیں جانتا کہ ہمارے محترم بزرگ نے کس مصلحت کی بناء پر، اس آیت مبارکہ کا آدھا حصہ ہی اس جگہ لگانا مناسب سمجھا۔ میں وہ پوری آیت مبارکہ لگاتا ہوں۔ غور فرمائیے گا۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے (ترجمہ: فتح محمد جالندہری)

اس آیت مبارکہ میں چار باتیں کہی جا رہی ہیں۔

"أَقَامُوا الصَّلَاةَ" "آتَوُا الزَّكَاةَ" "أَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ" "نَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ"

ذرا غور فرمائیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں سے صرف "صلوٰۃ و زکوٰۃ" کو ہی کیوں اسلامی ریاست یا حکومت سے مشروط کیا جارہا ہے؟ اگر اس آیت مبارکہ کے مطابق، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، صرف اپنی حکومت میں ہی ممکن ہیں، تو اس ہی طرح یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی تو اس ہی زمرے میں آتے ہیں۔ انہیں عربی زبان کے کس اصول اور قائدے کی رو سے، اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ اسلامی ریاست یا حکومت سے مشروط نہیں کیا گیا؟

دوستو، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، قرآن کریم کی رو سے دین کی اساس ہیں۔ اس کے بغیر دین کا تمکن ممکن ہی نہیں۔

جیسا کہ میں نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا ہے، کہ معاشرہ پہلے دن سے ہی تو وجود میں نہیں آجاتا۔ افراد کا مجموعہ ہی تو جماعت اور معاشرے میں تبدیل ہوتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ، اپنے لوگوں کی سوچ کا عکاس ہوتا ہے۔ اگر معاشرے کے افراد غلط روش زندگی کے حامل ہوں، تو وہ معاشرہ بحیثیت مجموعی بے راہرو معاشرہ بن جاتا ہے۔ تو پھر وہ کون سی گیدڑ سنگھی ہے کہ معاشرہ بے راہروہوں کا ہو، لیکن ان کے حکمران دین کے پابند ہوں۔ اللہ کے برگزیدہ بندے ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے؟

قرآن کریم مومنین کو ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس عمل کا حکم دیتا ہے۔ انسانوں میں سب سے پہلا مومن وہ نبی محترم ہوتا ہے، جسے اللہ وحی کی روشنی عطا فرماتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۷:۱۵۷)

جو اس پیغمبر (ﷺ) کی پیروی کریں گے جو نبی امی ہے جسے وہ اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو انہیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے جو ان کے لیے پاک و پسندیدہ چیزوں کو حلال اور گندی و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اتارتا ہے اور وہ زنجیریں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے

ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس (نبی امی) پر ایمان لائے اور اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور (روشنی) کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے یہی لوگ فوز و فلاح پانے والے ہیں۔
(ترجمہ: آیۃاللہ محمد حسین نجفی)

ذرا غور فرمائیں۔ فریضہ نبوت کیا ہے۔ کہا امر باالمعروف ، نہی عن المنکر ۔ یہ کسی ایک نبی کی بات نہیں ہے۔ ہر نبی یہ کچھ کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کوئی بھی نبی یہ فریضہ خداوندی ادا کر رہا ہوتا ہے، اس وقت کون سی حکومت یا ریاست موجود ہوتی ہے؟
حکومت یا ریاست کی بات تو ایک طرف کوئی اس نبی کی بات سننے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ تو ان بے راہرو لوگوں میں واحد انسان ہوتا ہے، جو اپنے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلا رہا ہوتا ہے۔ اور اس جرم کی پاداش میں، کبھی ریت پر گھسیٹا جاتا ہے، کبھی سنگسار کر دیا جاتا ہے، تو کبھی لکڑی کی طرح چِروا دیا جاتا ہے۔
اگر یہ فریضہ امر بالمعروف ، نہی عن المنکر ، ریاست سے مشروط ہو، تو اس گمراہ معاشرے کو کس طرح ایک ایسے معاشرے میں تبدیل کیا جاسکے گا؟ جس کے نتیجہ میں ریاست وجود میں آتی ہے۔
نبی ہی نہیں اس کے متبعین سب کے سب اس ہی فریضہ کی ادائیگی کے پابند ہیں۔ فرمایا۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (۳:۱۱۰)
تم بہترین اُمّت ہو جو سب لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے ظاہر کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو یقیناً ان کے لئے بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ ایمان والے بھی ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

غور فرمائیں، کہا تم بہترین امت ہو، کیوں، کہا اس لیے کہ تم "امر باالمعروف اور نہی عن المنکر "کا فریضہ انجام دیتے ہو، ساتھ ہی کہا، کہ اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۔ سوچیں کیا کہہ رہا ہے قرآن۔ اللہ پر ایمان بھی اس امر بالمعروف، نہی عن منکر کے ساتھ موجود ہے۔ اگر یہ امر بالمعروف ، نہی عن المنکر ، کسی ریاست یا حکومت سے مشروط ہوتا، تو پھر اللہ پر ایمان بھی اس ہی زمرے میں آنا چاہیے۔ تو پھر تو موج ہی موج ہے میرے بھائی۔ نہ اس وقت دنیا میں کوئی اسلامی ریاست موجود ہے نہ حکومت۔ تو پھر جان چھوٹی۔ نہ اللہ پر ایمان کی ضرورت ہے، نہ صلوٰۃ کی، نہ زکوٰۃ کی اور نہ امر بالمعروف کی، نہ نہی عن المنکر۔۔۔۔۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ فھل من مدکر ؟ ہے کوئی جو سمجھے ؟

دنیا میں ہر قوم پر اللہ کریم نے انبیاء علیہ سلام کو مبعوث فرمایا۔ تحقیق کر لیں، کتنوں کو حکومت ملی ؟ کتنے انبیاء صاحب اقتدار تھے ؟ تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں قرآن کریم کے ان چاروں بنیادی احکامت پر عمل نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے لیے مطلوب ریاست یا حکومت انہیں دستیاب ہی نہ تھی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹:۷۱)

اور اہلِ ایمان مرد اور اہلِ ایمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں۔ وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت بجالاتے ہیں، ان ہی لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا، بیشک اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

یہ مومنین کا اولین فریضہ ہے۔ ہر دور میں مومنین کو یہ ہی حکم دیا جاتا رہا۔ فرمایا

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۳:۱۰۴)

اور تم میں سے ایسے لوگوں کی ایک جماعت ضرور ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں اور بھلائی کا حکم دیں اور

برائی سے روکیں، اور وہی لوگ بامراد ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

یہ ہی نہیں کہ یہ حکم صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ دور نبوی میں وہ اہل کتاب، یعنی یہودی، عیسائی وغیرہ، ان کے نیک لوگ بھی، اس حکم پر عمل کرتے تھے۔ فرمایا

لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ (۳:۱۱۳)

مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اسکے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں (ترجمہ: ابو الاعلی مودودی)

يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۳:۱۱۴)

اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں یہ صالح لوگ ہیں (ترجمہ: ابو الاعلی مودودی)

غور فرمائیں، یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہو رہا ہے، جو دور نبوی ﷺ میں مدینہ میں موجود تھے۔ کہا ان میں سے بھی کچھ لوگ، " امر باالمعروف ونہی عن المنکر " کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ان اہل کتاب کی کون سی حکومت قائم تھی؟ کون سی ریاست قائم تھی؟ بلکہ یہ لوگ تو اسلامی ریاست میں مغلوب تھے۔ تو پھر وہ کیوں اس فریضہ کی ادائیگی کر رہے تھے؟ جس کے صلے میں اللہ رب العزت نے انہیں، صالحین کا خطاب عطا فرمادیا؟

سورہ لقمان میں، اپنے بیٹے کو کی جانے والی نصیحت اس درجہ بہترین تھی کہ قرآن نے اس انسانی وصیت کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ جناب لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں۔

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۳۱:۱۷)

اے میرے فرزند! تو نماز قائم رکھ اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر، بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

کیا جناب لقمان کے صاحبزادے کے پاس کوئی ریاست یا حکومت تھی؟ اگر نہ تھی، تو پھر وہ کس حیثیت میں یہ فریضہ ادا کر سکتے تھے۔ اگر اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، ایک اسلامی ریاست یا حکومت سے مشروط ہیں، تو پھر جناب لقمان کا اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرنا، اور قرآن کا اس نصیحت کو اپنے دامن میں جگہ دینا، کیا معنی رکھتا ہے۔

دوستو۔۔ اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ یہ چاروں ہی تو دین کی اساس ہیں۔ سارا دین ان چاروں فرائض میں آجاتا ہے۔ یہ پورے ایک نظام کا نام ہے، جو انفرادی سطح سے شروع ہو کر اجتماعی سطح تک پہنچتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں کفر ہو۔ جہاں انسانیت تلاش حق میں سرگرداں ہو، وہاں اس نظام کی ابتداء امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے ہوتی ہے۔ ایک فرد اپنے لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے، منکرات سے روکتا ہے۔ اس عمل کے دوران وہ ہر طرح کے مصائب و آلام سے گزرتا ہے، یہاں تک کے بعض اوقات جان سے ہی چلا جاتا ہے۔ اس طرح ایک سے دو، اور دو سے تین، پھر ایک جماعت وجود میں آجاتی ہے۔ جو اس نظام کے باقی اجزاء، یعنی اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے نفاذ کو یقینی بناتی ہے۔ چند افراد کی یہ جماعت، نہ حکومت کہلائی جاسکتی ہے اور نہ ریاست لیکن یہ عمل اس ریاست میں بھی مومنین کرتے رہتے ہیں، جو کفر کی حکومت ہو۔ غیر مسلم حکومت ہو۔ اگر کسی غیر مسلم حکومت و ریاست کی حدود میں، عبد مومن اس فریضہ سے ہی لاتعلق ہو جائے، تو آپ ہی سوچیں، کون سا طریقہ ہے جو اس کفر کی ریاست یا حکومت کو، اللہ کے قانون کے تابع کر دے؟

حقیقت کیا ہے۔ آیت مبارکہ (۲۲:۴۱) میں ایک لفظ کے من مانے ترجمہ نے بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس آیت مبارکہ میں لفظ "مَّكَّنَّاهُمْ " کا ترجمہ حکومت یا ریاست کر دیا گیا۔ جو درست نہیں ہے۔

عربی زبان میں، اس لفظ کا مادہ، "م ک ن" ہے۔ جس کے معنی دسترس، قدرت کے ہوتے ہیں۔ مکن شئی۔ چیز قوی و مضبوط ہو گئی، راسخ ہو گئی۔ اپنی جگہ پر جم گئی (تاج العروس)

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ(٦:٦)

کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہادیں، (مگر جب انہوں نے کفران نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

مزید فرمایا۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (٤٦:٢٦)

(اے اہلِ مکہ!) درحقیقت ہم نے ان کو ان امور میں طاقت و قدرت دے رکھی تھی جن میں ہم نے تم کو قدرت نہیں دی اور ہم نے انہیں سماعت اور بصارت اور دل و دماغ (کی بے بہا صلاحیتوں) سے نوازا تھا مگر نہ تو ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آسکے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ (ہی) ان کے دل و دماغ جبکہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار ہی کرتے رہے اور (بالآخر) اس (عذاب) نے انہیں آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، (ترجمہ: طاہر القادری)

چنانچہ، اس آیت مبارکہ میں اس لفظ " مَكَّنَّاهُمْ " کے معنی حکومت یا ریاست کے نہیں، بلکہ قدرت، طاقت، دسترس کے ہیں۔ اللہ کے نام پر اٹھنے والی وہ جماعت اللہ کریم کے حکم کے مطابق، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی ہوئی، ایک فرد سے ایک گروہ، اور ایک گروہ سے ایک جماعت، ایک قوم میں تبدیل ہوتی چلی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک قابل ذکر طاقت و قدرت کی مالک بنتی چلی جائے گی۔ یہ طاقت، یہ قدرت کسی بھی حکومت یا ریاست میں ہو سکتی ہے۔ ایک عبد مومن کسی غیر مسلم، یا کفر کی حکومت میں، اللہ کریم کے ان احکامات " اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر " سے اس بناء پر لاتعلق ہو کر نہیں رہ سکتا کہ جب ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی، تب میں یہ احکامات بجالاؤں گا۔ اگر یہ ایک عبد مومن، ایک فرد، ان فرائض کی ادائیگی کے لیے اکیلا ہی میدان عمل میں نہیں اترے گا، تو وہ معاشرہ تبدیل ہی کس طرح ہوگا؟

کیسے یہ ایک فرد، افرادو جماعت میں تبدیل ہو گا۔ چنانچہ اس آیت مبارکہ، کہ جس کے من مانے ترجمہ یا مفہوم سے، دین کے بنیادی پروگرام ہی کو، کسی حکومت یا ریاست سے مشروط کر دیا جائے، ایک بہت بڑی غلط نگہی ہے۔ بہت بڑا سہو ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ کا ترجمہ اس طرح ہو گا۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے (ترجمہ: فتح محمد جالندہری)

ایک عبد مومن اپنے غیر قرآنی معاشرے میں قرآن کریم کے ان اساسی پروگرام " أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ کی ابتداء کرتا ہے۔ ابتداء میں وہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کے حکم کے مطابق، اپنی جان و مال، طاقت و صلاحیت، کے مطابق اس مشن کی شروعات کرتا ہے۔ مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ تکالیف و اذیت سے گزرتا ہے۔ جان و مال کے نقصان برداشت کرتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ایک ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے، جو دین کے تمکن کا باعث بن جاتی ہے۔

اکیلا ہی چلا تھا، جانب منزل مگر
لوگ آتے گئے کارواں بنتا گیا

یہ ہی کچھ نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے کیا۔ تیرہ سال کی مسلسل محنت، مشقت، تکالیف، کرب و اذیت۔ اور اس کا حاصل 313 افراد۔ اور پھر دین کا تمکن۔ تمام پروگرام جو پہلے انفرادی تھا، اب اجتماعی ہو گیا۔ وہ نظام جو پہلے چند افراد پر مشتمل لوگ چلارہے تھے اب ایک باقائدہ جماعت کو منتقل ہو گیا۔ معاشرے کا ہر فرد، ان چاروں بنیادی پروگرامز پر اپنی اپنی جگہ پوری دیانت داری کے ساتھ عمل کرتا رہے گا۔ اقامت صلوٰۃ کرتا رہے گا۔۔ ایتائے زکوٰۃ کرتا رہے گا۔ امر بالمعروف کرتا رہے گا۔ نہی عن المنکر کرتا رہے گا۔ یہ عمل ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکے گا۔ اس کی کچھ عملی مثالیں دیتا ہوں۔

ہمارے ملک میں ایک قوم بستی ہے۔ آغا خانی۔ کبھی ان پر غور فرمائیں۔ یہ ایک بڑی جماعت ہے۔ ایک قوت کی مالک ہے۔ اپنے امام جناب آغا خان صاحب کی پیروکار ہے۔ چنانچہ اپنی فہم کے مطابق، جسے وہ لوگ درست سمجھتے ہیں اسے عملی طور پر اپنے معاشرے میں نافذ کر رکھا ہے۔ اس مرحلہ پر میں ان "آغا خانی" دوستوں کے عقائد پر بحث نہیں کر رہا۔ نہ ہی ان کے درست یا غلط ہونے پر کوئی تبصرہ کر رہا ہوں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جماعت کے طور پر ، پاکستان سمیت دنیا کے جس ملک میں بھی ہیں، اپنے امام کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ انہیں کسی حکومت کی ضرورت نہیں۔

بلکل ایسی ہی ایک جماعت "بوہری برادری" ہے۔ ان کا بھی کچھ ایسا ہی طریقہ کار ہے۔ ایک منظم گروہ یا جماعت کی صورت میں یہ لوگ بھی دنیا کے بہت سارے ممالک میں رہائش پذیر ہیں۔ اپنے امام کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ کیا انہیں کسی ریاست یا حکومت کی ضرورت ہے؟

اس ہی طرح، پاکستان سے باہر کئی ممالک میں ہمارے پاکستانی بھائیوں نے اپنے طور پر ایک کمیونٹی بنائی ہوتی ہے، جہاں وہ اپنی سوچ کے مطابق، اس ملک کے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے، اپنے اپنے عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیا انہیں کسی حکومت یا ریاست کی ضرورت ہوتی ہے؟

بات بلکل سیدھی ہے، اگر پہلے سے قائم شدہ کسی نظریہ کے بجائے، صرف اور صرف قرآن کریم کی تعلیمات کو سامنے رکھا جائے۔

قرآن کریم نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح، معاشی میدان میں بھی، اپنے پیروکاروں کو راہنمائی فراہم کی ہے۔ وہ ایسے نادار، محتاج، سائل و محروم افراد کی نگہداشت، اور ان کی زندگی کی لازمی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے ایک پورا نظام دیتا ہے۔ جسے "زکوٰۃ" کہتے ہیں۔ یہ ہر مومن پر فرض ہے۔ خواہ ایک اسلامی ریاست قائم ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ" (۲:۴۳)

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ (مل کر) رکوع کیا کرو، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۲۴:۵۶)

اور تم نماز (کے نظام) کو قائم رکھو اور زکوٰۃ کی ادائیگی (کا انتظام) کرتے رہو اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی (مکمل) اطاعت بجالاؤ تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے (یعنی غلبہ و اقتدار، استحکام اور امن و حفاظت کی نعمتوں کو برقرار رکھا جائے)، (ترجمہ: طاہر القادری)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲:۲۷۷)

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، اور ان پر (آخرت میں) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے،

(ترجمہ: طاہر القادری)

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ (۵:۵۵)

تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۙ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (۲۴:۳۷)

اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز و ادائے زکوۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

نہ صرف یہ کہ عام مومنین بلکہ نبی ﷺ کی فیملی بھی اس حکم خداوندی سے مستثنیٰ نہ تھی۔ فرمایا۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (۳۳:۳۲)

اے اَزواجِ پیغمبر! تم عورتوں میں سے کسی ایک کی بھی مِثل نہیں ہو، اگر تم پرہیزگار رہنا چاہتی ہو تو (مَردوں سے حسبِ ضرورت) بات کرنے میں نرم لہجہ اختیار نہ کرنا کہ جس کے دل میں (نِفاق کی) بیماری ہے (کہیں) وہ لالچ کرنے لگے اور (ہمیشہ) شک اور لچک سے محفوظ بات کرنا، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳:۳۳)

اور اپنے گھروں میں سکون سے قیام پذیر رہنا اور پرانی جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار مت کرنا، اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت گزاری میں رہنا، بس اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) اہلِ بیت! تم سے ہر قسم کے گناہ کا میل (اور شک و نقص کی گرد تک) دُور کر دے اور تمہیں (کامل) طہارت سے نواز کر بالکل پاک صاف کر دے، (ترجمہ: طاہر القادری)

تمام انبیاء علیہ سلام کو بھی "ایتائے زکوٰۃ" کا حکم دیا گیا۔ قرآن کریم میں اس حوالے سے بہت واضح طور پر بیان ہے۔ ایسا نہ تھا کہ اللہ کریم نے جن جن انبیاء علیہ سلام کو مبعوث فرمایا وہ سب کے سب کامیاب ہو گئے۔ قرآن ان انبیاء کا ذکر کرتا ہے کہ جن کو اذیت دی گئی۔ یہاں تک کہ قتل کر دیئے گئے۔ تو سوال یہ ہے کہ ایسی صورتحال میں، کہ جب جان بھی محفوظ نہ رہ سکی، یہ انبیاء کرام کیا ایتائے زکوٰۃ کے عمل سے غافل تھے؟ کیا وہ ایک ایسی ریاست کا انتظار کر رہے تھے جس کے قیام کے بعد وہ اس قرآنی فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" پر عمل کرتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ سلام کے احوال قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ریاست تو ایک طرف، اس عظیم المرتبت رسول اللہ کو چین سے جینے تک نہ دیا گیا۔ لیکن دیکھیں قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فرمایا

وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۱۹:۳۱)

اور میں جہاں کہیں بھی رہوں اس نے مجھے سراپا برکت بنایا ہے اور میں جب تک (بھی) زندہ ہوں اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (۱۹:۳۲)

اور اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بنایا ہے) اور اس نے مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا،

(ترجمہ: طاہر القادری)

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (۱۹:۳۳)

اور مجھ پر سلام ہو میرے میلاد کے دن، اور میری وفات کے دن، اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں گا،

(ترجمہ: طاہر القادری)

ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ (۱۹:۳۴)

یہ مریم (علیہا السلام) کے بیٹے عیسٰی (علیہ السلام) ہیں، (یہی) سچی بات ہے جس میں یہ لوگ شک کرتے ہیں،

(ترجمہ: طاہر القادری)

اب مجھے بتایا جائے کہ کیا حضرت مسیح علیہ سلام کو کبھی حکومت ملی۔ کوئی ریاست قائم کی۔ نہیں۔ لیکن انھیں حکم کیا دیا جارہا ہے، کہ جب تک زندہ رہو، تم "اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کرنے کے پابند ہو۔ اس آیت مبارکہ میں "میں جہاں کہیں بھی رہوں اور جب تک زندہ رہوں" کے الفاظ قابل غور ہیں۔ جہاں کہیں بھی رہوں۔ تو اب کیا جہاں کہیں بھی رہیں، ہر جگہ اپنی ریاست قائم کریں گے تاکہ "ایتائے زکوٰۃ" کے حکم خداوندی کی تعمیل کر سکیں؟

مزید ارشاد فرمایا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا [:]وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (۱۹:۵۵)

اور کتاب میں اسمٰعیل کا بھی ذکر کرو وہ وعدے کے سچے اور ہمارے بھیجے ہوئے نبی تھے۔ اور اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم کرتے تھے اور اپنے پروردگار کے ہاں پسندیدہ (وبرگزیدہ) تھے (ترجمہ: فتح محمد جالندہری)

غور فرمائیں، اللہ کا یہ نبی، نبی اکرم ﷺ کے جد امجد، یہ اپنے گھر والوں کو "اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا حکم کرتے تھے۔ کیوں اگر یہ عمل کسی حکومت یا ریاست سے مشروط تھا، تو کیوں اپنی فیملی کو اس بات کا پابند کرتے تھے؟

مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ (۲۱:۷۲) وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (۲۱:۷۱) وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ (۲۱:۷۳)

اور ہم ابراہیم (علیہ السلام) کو اور لوط (علیہ السلام) کو (جو آپ کے بھتیجے یعنی آپ کے بھائی ہاران کے بیٹے تھے) بچا کر (عراق سے) اس سرزمینِ (شام) کی طرف لے گئے جس میں ہم نے جہان والوں کے لئے برکتیں رکھی ہیں، اور ہم نے انہیں (فرزند) اسحاق (علیہ السلام) بخشا اور (پوتا) یعقوب (علیہ السلام ان کی دعا سے) اضافی بخشا، اور ہم نے ان سب کو صالح بنایا تھا۔ اور ہم نے انہیں (انسانیت کا) پیشوا بنایا وہ (لوگوں کو) ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف اَعمالِ خیر اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے (کے احکام) کی وحی بھیجی، اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے، (ترجمہ: طاہر القادری)

ذرا غور فرمائیں۔ یہ سارے انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ ان کے ذکر کے بعد فرمایا کہ انہیں "اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ سلام کے حوالے سے قرآن کریم میں واضح بیان ہے کہ آخر الامر ان کی قوم کو اس کی نافرمانیوں کے نتیجہ میں شدید عذاب الٰہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ قوم صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی۔ اب مجھے بتایا جائے، کہ حضرت لوط علیہ سلام کس طرح اس حکم خداوندی کو بجالاتے تھے، جبکہ حکومت اور ریاست تو ایک طرف، قوم تو اتنی نافرمان تھی کہ اسے عذاب الٰہی سے تباہ کرنا پڑا

اتنی واضح آیات قرآنی کی موجودگی میں ایک بار پھر "علامہ پرویزؒ" کے ان الفاظ کو غور سے پڑھیں۔

"اور دوسری غور طلب بات یہ ہے، کہ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے، کہ اسلامی مملکت زکوٰۃ دے گی، (اس حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہوگا) لہٰذا یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے، کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے، کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ کا پیسہ وصول کرے، یہ تصور قرآن کے تصور زکوٰۃ کے خلاف ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے، کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ" دینا ہے، نہ کہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا"۔
نظام ربوبیت، صفحہ نمبر 151، 152۔۔۔ از علامہ غلام احمد پرویزؒ

اب اس ضمن میں درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔ فرمایا

اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۹:۹)
انہوں نے آیاتِ الٰہی کے بدلے (دنیوی مفاد کی) تھوڑی سی قیمت حاصل کر لی پھر اس (کے دین) کی راہ سے (لوگوں کو) روکنے لگے، بیشک بہت ہی برا کام ہے جو وہ کرتے رہتے ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ (۹:۱۰)
نہ وہ کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا، اور وہی لوگ (سرکشی میں) حد سے بڑھنے والے ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۹:۱۱)
پھر (بھی) اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو (وہ) دین میں تمہارے بھائی ہیں، اور ہم (اپنی) آیتیں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو علم و دانش رکھتے ہیں، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُونَ (۹:۱۲)

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو تم (ان) کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو بیشک ان کی قَسموں کا کوئی اعتبار نہیں تا کہ وہ (اپنی فتنہ پروری سے) باز آجائیں،(ترجمہ: طاہر القادری)

ذرا غور فرمائیں۔ یہ سورہ توبہ کی آیات مبارکہ ہیں۔ یہ مدنی سورہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک اسلامی ریاست قائم ہو چکی ہے۔ اس ریاست میں موجود ایسے لوگ جو دین کی مخالفت میں پیش پیش ہیں، ان کے حوالے سے کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اس میں بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ اگر یہ توبہ کر لیں، اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر عمل کریں، تو یہ تمہارے بھائی ہیں۔ اب اگر ایک اسلامی ریاست زکوٰۃ لینے کی مجاز ہی نہیں ہے، تو یہ کس طرح کا حکم ہے۔ یہ باغی لوگ کس کو زکوٰۃ دیں گے، تاکہ ان کی نیک نیتی ظاہر ہو جائے؟
مضمون کی طوالت کا خدشہ مجھے ان تمام آیات مبارکہ کو پیش کرنے سے روک رہا ہے، جو اس ضمن میں موجود ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دین کا کوئی بھی رکن، دین کی کوئی بھی راہنمائی، دین کا کوئی بھی حکم، کسی مخصوص دور، حالات سے مشروط نہیں۔ یہ ایک مومن کے ایمان کے ساتھ ہی اس پر نافذ العمل ہوتا ہے۔

اگر ایک مومن کسی ایسے معاشرے کا فرد ہے جہاں زنا ایک جرم نہ ہو، تب بھی وہ مومن زنا کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ اگر کسی معاشرے میں سود عام ہو، جائز ہو، تب بھی مومن سود سے بچے گا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں مومنین کمزور ہوں ، جہاں ان کے پاس دین کے ارکان اور ہدایات پر عمل درآمد کے لیے طاقت دستیاب نہ ہو وہاں یہ مومنین اپنی انفرادی حیثیت میں دین کے احکامات پر عملدرآمد کریں گے۔ اور اپنی پوری توجہ، ایک ایسی جماعت کی تشکیل پر

صرف کر دیں گے، جو آگے جا کر زمین میں طاقت حاصل کر لے۔ تا کہ دین کے وہ تمام ارکان، احکامات و ہدایات جو پہلے انفرادی حیثیت میں ادا کئے جا رہے تھے وہ اجتماعی حیثیت اختیار کر لیں۔

قرآن کریم زنا کی سزا سو کوڑے تجویز کرتا ہے۔ اب ایک ایسے معاشرے میں، جہاں مومنین کے پاس اس حکم پر عملدرآمد کے لیے مطلوبہ طاقت ہی دستیاب نہ ہو، کس طرح اس حکم کو نافذ کیا جا سکتا ہے؟ لیکن کیا اس بناء پر وہ مومنین انفرادی سطح پر زنا سے گریز کرنے کے پابند نہ ہوں گے؟

ایسے احکامات جن کے لیے واقعی ایک ریاست کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً قرآنی تعزیرات۔ اس معاشرے میں وہ کسی اور کو اس جرم کی پاداش میں سو کوڑوں کی سزا نہیں دے سکتا۔ نہ چور کو قرآنی سزا دے سکتا ہے۔ اس مقام پر بھی مومن خود اپنی انفرادی حیثیت میں ان احکامات کو اپنی اور اپنی فیملی کی حد میں نافذ کرے گا۔ اور ایسے معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد کرے گا، جہاں اللہ کا دین اپنی تمام تر راہنمائیوں اور ہدایات کے ساتھ عملی طور پر نافذ ہو جائے۔ جہاں دین کے ان احکامات پر بھی عمل درآمد کیا جا سکے، جو طاقت نہ ہونے کی وجہ سے ایک غیر اسلامی معاشرے میں ممکن العمل نہ ہوں۔

چنانچہ دین کا ایک ایک حکم، ایک ایک ہدایت، ہر لمحہ، ہر گھڑی، ہر حال میں، مومنین پر نافذ ہوتا ہے البتہ ان پر عمل درآمد کی حکمت عملی اپنے حالات کے مطابق، باہمی مشاورت سے طے کی جائے گی۔ یہ ہی صورتحال "زکوٰۃ" کی ہے۔ معاشرے کے صاحب حیثیت لوگ اپنے مال میں سے ایک مخصوص رقم اپنے سائل و محروم، یتامیٰ و مساکین بھائیوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے وقف کریں گے۔ وہ لوگ جو اپنے عمل صالحہ کے نتیجہ میں جنت کے حقدار ٹھہریں گے، ان کے حوالے سے قرآن کریم نے اس حقیقت کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرمایا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ [۵۱:۱۵] آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ [۵۱:۱۶] كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ [۵۱:۱۷] وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ [۵۱:۱۸] وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ [۵۱:۱۹]

البتہ متقی لوگ اُس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔۔ جو کچھ اُن کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔ پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے۔ اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔ (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

ذرا غور فرمائیں، کیا بات ہو رہی ہے۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنھیں قرآن متقین کا سرٹیفکٹ عطا فرما رہا ہے۔ ان کے لیے جنت کی نعماء کا ذکر کر کے کہا کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے مال میں سائل و محروم کا حق تھا۔ یہ کسی حکومت یا ریاست کی بات نہیں ہو رہی۔ عام لوگوں کی بات ہو رہی ہے۔ کہا ان کے مال میں " أَمْوَالِهِمْ " ۔ غور فرمائیں کہا ان کا مال۔ یہ معاشرے کے صاحب حیثیت افراد کی بات ہو رہی ہے۔ کہا ان کے مال میں ان لوگوں کے لیے جو سائل و محروم ان کا ایک حق تھا۔

اس مقام پر لازم ہے کہ ہم ان دو الفاظ "سائل" اور "محروم" کے حقیقی معنوں سے بھی آشنا ہو جائیں۔
عربی زبان میں "سائل" کا مادا "س ا ل" ہے۔ اس کے معنی دریافت کرنا بھی ہے، اور طلب کرنا بھی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
عربی زبان میں " محروم " کا مادہ " ح ر م " ہے۔ اس کے معنی کسی شئے کو شدت سے روکنے کے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ " حلال " کی ضد ہے جسے کے معنی رسیاں توڑ کر آزاد کرنے کے ہوتے ہیں۔ اس جہت سے وہ لوگ جن کی ضروریات اس درجہ رک جائیں کہ ان کے پاس کچھ بھی نہ رہے "المحروم" کہلاتے ہیں (تاج و محیط)
قرآن کریم نے اس لفظ کو بڑی فصاحت سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ (٦٨:١٧)وَلَا يَسْتَثْنُونَ (٦٨:١٨)فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ (٦٨:١٩)فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ (٦٨:٢٠)فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ (٦٨:٢١)أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ (٦٨:٢٢)فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ

(۶۸:۲۳)أَن لَّا يَدۡخُلَنَّهَا ٱلۡيَوۡمَ عَلَيۡكُم مِّسۡكِينٌ (۶۸:۲۴)وَغَدَوۡا عَلَىٰ حَرۡدٍ قَٰدِرِينَ (۶۸:۲۵)فَلَمَّا رَأَوۡهَا قَالُوٓا إِنَّا لَضَآلُّونَ (۶۸:۲۶)بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُومُونَ (۶۸:۲۷)

بیشک ہم نے انہیں اسی طرح آزمالیا جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا جبکہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی اس باغ کے پھل اتار لیں گے۔ اور انشاءاللہ نہ کہا۔ پس اس پر تیرے رب کی جانب سے ایک بلا چاروں طرف گھوم گئی اور یہ سو ہی رہے تھے۔ پس وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔ اب صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو آوازیں۔ کہ اگر تمہیں پھل اتارنے ہیں تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی سویرے چل پڑو۔ پھر یہ سب چپکے چپکے یہ باتیں کرتے ہوئے چلے۔ کہ آج کے دن کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے پائے۔ اور لپکے ہوئے صبح صبح گئے۔ (سمجھ رہے تھے) کہ ہم قابو پا گئے۔ جب انہوں نے باغ دیکھا تو کہنے لگے یقیناً ہم راستہ بھول گئے۔ نہیں نہیں بلکہ ہماری قسمت پھوٹ گئی (ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

یہ ہیں "محروم"۔ جن کا کچھ بھی باقی نہ بچے۔ سب کچھ ختم ہو جائے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جو زندگی میں اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ جن کے پاس نہ تو کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، اور نہ رہنے کو چھت۔ کہا ان میں کچھ ایسے ہوں گے، جو اپنی ضرورت، اپنی حاجت تمہارے سامنے بیان کر سکتے ہوں گے، لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جو کسی سے کچھ مانگنے کا حوصلہ ہی نہ رکھتے ہوں۔ کہا ان لوگوں کا حق ہے تمہارے مال میں۔ تم پر لازم ہے کہ ان کی جائز ضروریات کو پورا کرو۔ ان کی امداد کرو، خیرات میں نہیں، بلکہ ان کا حق سمجھ کر۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق کتنا ہے؟

کہا یہ ایک طے شدہ مقدار ہونی چاہیے۔ ہم تم سے تمہارا سارا مال نہیں مانگتے البتہ تمہیں ایک مقررہ مقدار میں ان سائل و محرومین کا حق ان تک پہنچانا ہو گا۔ فرمایا۔

ٱلَّذِينَ هُمۡ عَلَىٰ صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُونَ (۷۰:۲۳)

جو اپنی نماز پر ہمیشگی قائم رکھنے والے ہیں،(ترجمہ: طاہر القادری)

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ (۷۰:۲۴)

اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے،(ترجمہ: طاہر القادری)

لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۷۰:۲۵)

مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا،(ترجمہ: طاہر القادری)

اس حوالے سے بھی مفہوم کی آڑ میں ان آیات مبارکہ کا من مانا ترجمہ کر کے، آیات ربی کو ان کے سیاق وسباق سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی "انفاق" کے نام پر لوگوں سے ان کی ساری زندگی کی محنت کی کمائی ہتھیانے کی بات کی جاتی ہے۔ تو کبھی زکوٰۃ کے نام پر۔ کہ جناب آپ اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے ریاست بزور طاقت سب آپ سے حاصل کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ سب کا سب ان سائل و محروم کا حق ہے۔ آپ اس حق کی ادائیگی کے پابند ہیں۔ آیات بالا میں واضح الفاظ میں اللہ کریم نے فرمادیا کہ سائل و محروم کا یہ حق لا محدود نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی مقدار کے حوالے سے کوئی قدغن ہے۔ آیت مبارکہ میں اس حق کو " حَقٌّ مَّعْلُومٌ " کہا گیا ہے عربی زبان میں اس لفظ "معلوم" کا مادہ "علم" ہے۔ جس کے معنی کسی شئے کو کماحقہ جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک ہونا، محکم طور پر جان لینا ہے (تاج، محیط، راغب)

آیئے تصریف آیات کی رو سے اس لفظ "معلوم" کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (۲٦:۳۸)

پس سارے جادوگر مقررہ دن کے معینہ وقت پر جمع کر لئے گئے،(ترجمہ: طاہر القادری)

قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (۲٦:۱۵۵)

(صالح علیہ السلام نے) فرمایا: (وہ نشانی) یہ اونٹنی ہے پانی کا ایک وقت اس کے لئے (مقرر) ہے اور ایک مقررہ دن تمہارے پانی کی باری ہے،(ترجمہ: طاہر القادری)

وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵:۲۱)

اور (کائنات) کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ ہمارے پاس اس کے خزانے ہیں اور ہم اسے صرف معیّن مقدار

کے مطابق ہی اتارتے رہتے ہیں،(ترجمہ: طاہر القادری)

آیات بالا، اس لفظ "معلوم" کا درست مفہوم متعین کر رہی ہیں۔ چنانچہ آیت مبارکہ سورہ المارج میں "حق معلوم" کا معنی ایک متعین اور مقرر حق ہے۔ یہ کوئی لا محدود حق نہیں ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم پر تدبر و تفکر کرنے والے احباب جانتے ہیں کہ اللہ کریم نے دین اوراس کے حوالے سے جو احکامات دیئے، ان میں سے کچھ کی جزیات اس نے خود ہی طے کر دیں ہیں۔ لیکن زیادہ تر احکامات کے حوالے سے مومنین کو باہمی مشاورت سے ان کی جزیات طے کرنے کا حکم دیا۔

یہ ضروری امر تھا۔ اگر اللہ کریم تمام امور کے حوالے سے ان کی جزیات خود ہی طے فرمادیتے، تو یہ قرآن ایک عالمگیر راہنمائی کہلا ہی نہیں سکتا تھا۔ قرآن کریم اللہ رب العزت کی آخری کتاب ہے۔ اس کتاب نے قیامت تک کے تمام انسانوں کو راستہ دکھانا ہے۔ ہر خطہ زمین کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی اپنی ایک معاشرت ہوتی ہے۔ ہر وقت کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہی بہترین لائحہ عمل تھا کہ اصول عطا فرمادیئے جائیں، اور ان پر عمل درآمد کے طریقے اور انکی جزیات مومنین اپنے اپنے علاقوں اور اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود ہی طے کریں۔ چنانچہ اصول کے طور پر یہ حکم دے دیا گیا کہ صاحب حیثیت مومنین کے مال میں ان سائل و محرومین کا ایک متعین حق ہے۔ جو انہیں ادا کرنا ہو گا۔

اب یہ سوال کہ کس حیثیت کے حامل لوگ، صاحب حیثیت کہلائیں گے، اور ان کے مال میں سائل و محروم کا کتنا حق ہونا چاہیے، اس بات کا فیصلہ مومنین باہمی مشاورت سے، اپنے مقامی حالات وضروریات، کے مطابق خود طے کریں گے۔ اگر کسی خطہ زمین کے مومنین زیادہ خوشحال ہوں، وہاں پر سائل و محرومین کے تعداد کم ہو گی، تو اس خطہ زمین کے مومنین باہمی مشاورت سے اس ضرورت کے مطابق زکوٰۃ کا نصاب مقرر کریں گے۔ اگر کسی دوسرے خطہ میں زیادہ غربت ہو گی، زیادہ سائل و محرومین ہوں گے، تو وہاں کے لوگ اپنی ضروریات کے مطابق، زکوٰۃ کا نصاب مقرر کریں گے۔

دور نبوی ﷺ میں اس وقت کے تقاضے اور ضروریات کے مطابق اللہ کے نبی ﷺ نے زکوٰۃ کی موجودہ شرح مقرر کی تھی ۔ آج اگر مومنین کی جماعت کسی خطہ زمین پر تمکن حاصل کر لے گی، تو وہ اپنی آج کی ضروریات کے مطابق، باہمی مشاورت سے زکوٰۃ کی موجودہ شرح میں ردوبدل کی مجاز ہو گی۔

جب مومنین کی کوئی جماعت زمین میں اتنی طاقت حاصل کر لے گی، کہ وہاں پر اللہ کے قانون بزور تعزیر نافذ کر سکے، تو دین کے ان بنیادی ارکان "اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر" پر بزور تعزیر و طاقت عملدرآمد کے لیے باہمی مشاورت سے قانون سازی کرے گی۔ اور پھر ان قوانین پر طاقت سے عمل درآمد کروایا جائے گا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، جب کچھ قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا، تو خلیفہ وقت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان قبائل کے خلاف باقائدہ جنگ کی، اور بزور طاقت ان سے زکوٰۃ وصول کی۔

ایک اسلامی معاشرے میں، دین کے وہ ارکان اور احکامات، کہ جو تمکن ارض کی عدم موجودگی میں انفرادی حیثیت میں نافذ العمل تھے، اب اجتماعی حیثیت میں نافذ العمل ہوں گے۔ ان قوانین اور ہدایات ربانی کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے مومنین ان تمام امور میں، جن کی جزیات اللہ کریم نے خود طے نہیں کر دیں، باہمی مشاورت سے قانون سازی کریں گے۔ اور ان پر عملدرآمد کے طریقے وضع کریں گے۔ امت کی اکثیریت کے طے کئے ہوئے قوانین اس معاشرے میں تبلیغ وطاقت دونوں طریقوں سے نافذ کئے جائیں گے۔

سلامت رہیں

# حرف آخر

دوستو۔ اللہ رب العالمین، مالک و خالق، علیم و خبیر، نے اپنی مشیت کے مطابق، اس کائنات کو تخلیق کیا۔ پھر اس میں اپنی مرضی و منشاء کے رنگ بھرے۔ سرسبز و شاداب باغات، اونچے اونچے پہاڑ، ان سے گرتے ہوئے سحر انگیز جھرنے، شور مچاتے ہوئے دریا، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر، وسیع و عریض صحرا، آسمان سے برستے بادل، ان میں کڑکتی بجلیاں، خلاء کی وسعتوں میں میں گردش کرتے ہوئے عظیم الجثۃ اجرام فلکی، گرمی و روشنی دینے والا سورج، ٹھنڈک پہنچانے والا چاند، اور نہ جانے کیا کیا۔ پھر ان سب میں انواع اقسام کی مخلوقات۔
ہواوں میں اڑتے رنگ برنگے پرندے، دریا و سمندر میں تیرتے آبی جاندار، زیرزمین انواع اقسام کے کیڑے مکوڑے، زمین کے اوپر چلتے پھرتے جانور، جمادات، نباتات، حیوانات۔ اور پھر ان کا شہنشاہ، حضرت انسان۔

یہ عظیم الشان کارگہ حیات، آخر کیوں؟ کیا یہ کہ کسی دن اللہ کریم کے دل میں اچانک کوئی امنگ جاگ اٹھی، کوئی سوچ پیدا ہوگئی۔ اور اس نے کن کہا۔ اور یہ سب ہوگیا۔ ارشاد باری تعالٰی ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم ۗ مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ (۳۰:۸)

کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرّر مدت ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

مزید فرمایا۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۶۴:۳)

اسی نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مقصد کے ساتھ پیدا فرمایا اور (اسی نے) تمہاری صورتیں بنائیں پھر تمہاری صورتوں کو خوب تر کیا، اور (سب کو) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

تخلیق کائنات، تخلیق انسان یہ سب کچھ " بالحق " تخلیق کیا گیا ہے۔ پیدا کرنے والے کے ذہن میں ایک متعین اسکیم کے تحت۔ ایک پروگرام کے تحت۔ کہا

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (۲۱:۱۶)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے طور پر (بے کار) نہیں بنایا، (ترجمہ: طاہر القادری)

یعنی جو کچھ بھی تخلیق کیا گیا۔ مشیت کے عظیم الشان پروگرام کے تحت ہے۔ اس کی اسکیم کے مطابق ہے۔ لیکن قابل غور بات، جسے سمجھنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، کہ یہ کائنات ایک عرصہ معینہ کے لیے ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ایک دن اس ساری کائنات نے ختم ہو جانا ہے۔ لیکن اس کائنات کی ایک شئے ایسی ہے، جس نے اس کائنات کے خاتمے کے بعد بھی، آگے چلنا ہے۔۔ مزید آگے بڑھنا ہے۔ یعنی اس حضرت انسان۔ فرمایا۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۲۳:۱۱۵)

کیا تم یہ گمان کئے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے۔ (ترجمہ: محمد جوناگڑھی)

سوال یہ ہے کیوں؟ جب اس کائنات کا اختتام ہو جائے گا۔ ہر شئے کا خاتمہ ہو جائے گا، تو پھر کیوں انسان ہی ختم نہیں ہو گا؟ بلکہ وہ اپنے اعمال کے ساتھ اپنے رب کے سامنے پیش ہو گا۔

کیا ہو گا وہاں؟

کہا وہاں تمہارے اعمال کے نتیجہ میں، جنت یا جہنم ملے گا۔ جہنم کی زندگی، کہا۔ ذلت ورسوائی کی زندگی ہو گی۔ ناکامی و نامرادی کی زندگی ہو گی۔ درد واذیت کی زندگی ہو گی۔ لفظ جہنم کے معنی ہوتے ہیں، ٹھہرا دیا جانا۔ روک دیا جانا۔ اس جگہ انسان کی زندگی ایک دائرے کی زندگی ہو گی۔ جہاں آگے کوئی مقام نہیں ہو گا۔ لیکن دوسری جانب جنت کی زندگی، کامیابی وکامرانی کی زندگی۔ مسرت وشادمانی کی زندگی، عزت وتکریم کی زندگی۔ مزید آگے بڑھنے کی زندگی۔ بلندی کا سفر۔ عروج کا سفر۔

شعور کی موجودہ سطح پر ہم، اس جنت و جہنم کی کنہ وماہیت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہم نہیں جانتے، وہ جنت اور جہنم کہاں ہو گا۔ کیسا ہو گا۔ کس مقصد کے لیے ہو گا؟ قرآن کریم نے جس جگہ بھی ان مقامات کا ذکر کیا ہے وہاں انھیں تمثیلاً بیان کیا ہے۔

اس ہی سوال کے جواب میں ہمارے درد کا درماں چھپا ہوا ہے۔ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں۔ وہ رب کائنات کیا چاہتا ہے۔ اس کی مشیت نے کیا طے کیا ہوا ہے۔ اس کی اسکیم کیا ہے۔ آیئے تفکر وتدبر سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات وہاں سے شروع کرتے ہیں، کہ اس مالک وخالق نے اس کائنات، اور اس کے درمیان جو کچھ بھی ہے ،اس کی تخلیق کے بعد، اپنے پروگرام کے آخری حصہ میں، انسان کو تخلیق کیا۔ بہت ہی شاندار اور حیرت انگیز تخلیق ۔ فرمایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵:۴)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے، (ترجمہ: طاہر القادری)

تخلیق انسانی، اس مالک وخالق کا عمل احسن ہے۔ توازن بدوش، خوبصورت۔

پیدا فرمادیا، عزت سے نوازا۔ مقام بلند عطا فرمایا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (۱۷:۷۰)

اور بیشک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری (یعنی شہروں اور صحراؤں اور سمندروں اور دریاؤں) میں (مختلف سواریوں پر) سوار کیا اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور ہم نے انہیں اکثر مخلوقات پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے فضیلت دے کر برتر بنا دیا، (ترجمہ: طاہر القادری)

عزت بخشی، چلنے پھرنے کے لیے سواریاں عطا کیں۔ زندگی کی بنیادی ضرویات کو پورا کرنے کے لیے پاکیزہ رزق عطا فرمایا۔ اوراپنی تمام تخلیقات میں سے اکثیریت پر، فضیلت عطا فرمائی۔ چنانچہ ہر انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے، واجب التکریم ہے۔ اس لیے واجب التکریم ہے کہ وہ انسان ہے۔ چاہے کسی رنگ کا ہو۔ کسی نسل یا قوم کا ہو۔ کسی زبان کا بولنے والا ہو۔ کالا ہو، گورا ہو۔ یکساں طور پر واجب التکریم۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۴۹:۱۳)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے (ترجمہ: ابوالاعلیٰ مودودی)

یہ سارے تفرقات، رنگ، نسل، قوم، قبائل۔ یہ سب اس لیے کئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ورنہ ہمارے یہاں وہ سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ، قانون خداوندی کا پابند ہے۔ تکریم انسانی کے معنی یہ نہیں کہ سب ایک برابر ہیں کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ فرمایا۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۳۵:۱۹) وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ (۳۵:۲۰) وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ (۳۵:۲۱) وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ (۳۵:۲۲)

اور اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، اور نہ تاریکیاں اور نہ نور (برابر ہو سکتے ہیں)، اور نہ سایہ اور نہ دھوپ، اور نہ زندہ لوگ اور نہ مُردے برابر ہو سکتے ہیں، بیشک اللہ جسے چاہتا ہے سنا دیتا ہے، اور آپ کے ذمّہ ان کو سنانا نہیں جو قبروں میں (مدفون) ہیں (یعنی آپ کافروں سے اپنی بات قبول کروانے کے ذمّہ دار نہیں ہیں)، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (١٦:٧٦)

اور اللہ نے دو (ایسے) آدمیوں کی مثال بیان فرمائی ہے جن میں سے ایک گونگا ہے وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے وہ (مالک) اسے جدھر بھی بھیجتا ہے کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا وہ (گونگا) اور (دوسرا) وہ شخص جو (اس منصب کا حامل ہے کہ) لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور وہ خود بھی سیدھی راہ پر گامزن ہے (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں، (طاہر القادری)

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (٣٩:٩)

(کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں (ترجمہ: ابو الاعلی مودودی)

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ (٤٠:٥٨)

اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائے اور ایماندار و صالح اور بدکار برابر ٹھیریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو (ترجمہ: ابو الاعلی مودودی)

انسان اپنے اعمال کے نتیجے میں درجات میں تقسیم ہوتا چلا جائے گا۔ کوئی اپنے رب کے حکم کا فرمابردار بن کر اوپر، اور اوپر کی منازل طے کرتا چلا جائے گا۔ تو کوئی اپنی نافرمانیوں کے صلے میں ایک جگہ ٹھہرا دیا جائے گا۔ یہ عمل اس دنیا میں بھی ہو گا، اور اس کے بعد والی حیات آخر میں بھی۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک کلاس روم ہے، جس میں سو بچے زیر تعلیم ہیں۔ ان کے ماں باپ کی خواہش ہے کہ ان کے بچے ڈاکٹر بن جائیں۔ پرائمری سے ان بچوں کی تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے۔ سب بچوں کو ایک ہی کلاس روم میں ایک ہی استاد تعلیم دیتا ہے۔ لیکن کیا ہوتا ہے سالانہ امتحان میں کوئی بچہ اول آجاتا ہے، کوئی دوئم، کوئی سوئم۔ اور کوئی فیل ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہوتا ہے۔ وہ بچے جو کامیاب ہو جاتے ہیں، انہیں اگلی کلاس میں ترقی مل جاتی ہے۔ پہلی کلاس سے دوسری کلاس میں ترقی کر جاتے ہیں۔ اور وہ بچے جو فیل ہو گئے، انہیں اس سابقہ کلاس میں ہی ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ اس ہی کو عربی زبان میں "جہیم" کہتے ہیں۔ ایک جگہ ٹھہرا دیا جانا۔

اب وہ بچے جو کامیاب ہو کر، پہلی کلاس سے دوسری کلاس میں ترقی کر جاتے ہیں، ان کی تعداد سو بچوں سے کم ہو کر نوے رہ جاتی ہے اس طرح یہ سفر آگے چلتا ہے۔ ایک مقام پر جب اسکول کی سطح کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے، تو سو بچوں کا وہ قافلہ جو پہلی کلاس سے چلا تھا اب پچاس رہ جاتا ہے۔ یہ وہ بچے ہیں جو اپنی محنت سے وہ مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں، جو کسی کالج میں داخلے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

اب ان پچاس بچوں میں آگے نکل جانے کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخر الامر پچاس میں پچیس بچے ہی میڈیکل کالج میں داخلے کے اہل رہ جاتے ہیں۔ پھر اس مرحلے میں مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان پچیس بچوں میں سے پندرہ یا بیس بچے ڈاکٹر بن کر باہر نکلیں۔ اس کے بعد ان کی عملی زندگی اور اس میں کامیابی کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے، کوئی کسی شعبہ کا ماہر بن جاتا ہے، تو کوئی بس ایک عام ڈاکٹر بن کر ہی رہ جاتا ہے۔

بلکل یہ ہی عمل ہے۔ اس خالق کائنات نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ پھر انسان کو تخلیق کیا۔ پھر ان انسانوں کو راہنمائی فراہم کی، انہیں بتایا کہ اس دنیا کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ تم اپنی ذات کی نشو و نما کر لو۔ کیونکہ اس کائنات کے خاتمے کے بعد ہماری اسکیم کے مطابق، جس دنیا میں تمہیں مزید ارتقائی منازل طے کرنی ہیں، اس دنیا میں داخلے کی

اہلیت ایک نشو و نما یافتہ انسانی ذات ہے۔ انسانی ذات کی یہ نشو و نما، انسان کے اس طبعی جسم کے بغیر ناممکن تھی۔ چنانچہ انسان کو یہ جسم عطا کیا اور ایسے اعمال کرنے کی ہدایت عطا فرمائی جس کے نتیجہ میں انسانی ذات کی نشو و نما ہو سکے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے، اسے اس دنیا میں مختلف انداز میں گردشیں دی گئیں۔ ایسے مواقع بہم پہنچائے گئے، جس کے نتیجہ میں انسان اپنے رب کے حکم کے مطابق عمل کرکے، اپنی ذات کی نشو و نما کر سکے۔ یہ بلکل ویسا ہی عمل ہے، جیسا کہ ایک عام آدمی کو ایک اچھا فوجی، ایک اچھا سپاہی بنانے کے ضمن میں اختیار کیا جاتا ہے۔ کیا کرتے ہیں، کبھی لمبی لمبی دوڑیں لگواتے ہیں۔ کبھی دریا میں کود جانے کا کہتے ہیں۔ کبھی اونچائی سے چھلانگیں لگواتے ہیں۔ کبھی رکاوٹیں کھڑی کرکے، اس کو عبور کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کبھی رات میں، کبھی دن میں، کبھی گرمیوں میں، کبھی سردیوں میں، کبھی بارشوں میں، کبھی برف باری میں، مختلف طریقوں سے اس کی ٹریننگ کرتے ہیں۔ کس لیے؟ اس لیے تاکہ ایک ایسا سپاہی تیار ہو جائے، جو جنگ کی صورت میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا جانتا ہو۔

بس یہ ہی بات ہے۔ شعور کی موجودہ سطح پر ہم نہیں جانتے کہ انسان کی موت کے بعد، اس کائنات کے خاتمے کے بعد ،اس رب کریم کی اسکیم کیا ہے۔ وہ ہم سے اس دنیاوی حیات کے خاتمے کے بعد، اس دوسری دنیا کی زندگی میں کیا کروانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی دنیا جسے ہم جان ہی نہیں سکتے۔ جو کبھی دیکھی ہی نہ ہو، اس کے متعلق کوئی بات سمجھائی بھی کیسے جا سکتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حیات بعد الممات کے حوالے سے جو کچھ بھی قرآن کریم میں بیان ہوا ہے، وہ تمثیلاً ہوا ہے۔ شعور کی موجودہ سطح پر ہم جنت اور جہنم کی کنہ و حقیقت سے آگاہ ہو ہی نہیں سکتے۔

یہ بلکل وہی مقام ہے، جب ہم اپنے ایک بچے کو پرائمری میں داخلہ دلواتے ہیں۔ ہمارے دل میں، ہمارے ذہن میں اس بچے کو ڈاکٹر بنوانے کے حوالے سے سارا لائحہ عمل موجود ہوتا ہے۔ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ پہلے پرائمری پاس کرنی ہے، پھر مڈل پاس کرنی ہے، پھر کالج، پھر میڈیکل کالج۔ لیکن اس چند سالہ بچے کو جسے ہم پرائمری میں داخل کروانے آئے ہیں، یہ سارے مراحل سمجھا ہی نہیں سکتے۔ اس ہی لیے ہم اپنے بچے سے پہلے پرائمری کے لیول کی باتیں کرتے ہیں، جب وہ بچہ پرائمری پاس کر لیتا ہے، تو اس مقام پر وہ پرائمری سے آگے کی تعلیم کے شعور کا مالک بن جاتا ہے۔

اللہ کریم نے انسانوں کو آخر الامر کیا بنانا ہے۔ کس مقام تک پہنچانا ہے۔ شعور کی موجودہ سطح پر ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے ہمیں صرف اس دنیا کے حوالے سے، جو کچھ کرنا ہے، اس کی راہنمائی فراہم کر دی ہے۔ یہ بتادیا ہے کہ تمہاری آگے کی ترقی کا دارومدار، اس دنیا میں تمہاری کارکردگی سے مشروط ہے۔ اسے بتادیا گیا کہ اس دوسری دنیا میں تمہارے اس جسم نے نہیں بلکہ تمہاری ذات نے سفر کرنا ہے۔ تمہارا یہ جسم اس دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ اس دنیا میں اس طبعی جسم کے مطابق قوانین ہیں، لیکن اس دوسری دنیا میں **"انسانی ذات"** کے مطابق قوانین ہوں گے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے، اس دنیا میں انسانوں کو مسابقت کے عمل سے گزارہ جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ تم نے اس دنیا میں "عمل صالحہ" کرنے ہیں۔ تا کہ تمہاری ذات کی نشوونما ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وَالْعَصْرِ (۱۰۳:۱)إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (۱۰۳:۲)إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳:۳)

ساری انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہی رہتا ہے، ماسوا ان کے جو ایمان لائے، عمل صالحہ کیے، حق اور صبر کو اختیار کیا۔ مفہوم

عربی زبان میں "صلح" کے معنی کسی شئے کا ویسا ہو جانا ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ یہ لفظ "فساد" کی ضد ہے جس کے معنی کسی شئے کا ویسا نہ ہونا ہے جیسا اسے ہونا چاہیے۔ چنانچہ "عمل صالحہ" کے معنی ایسے اعمال ہیں، جن کے نتیجہ میں اس دنیا میں ہر شئے ویسی ہوتی چلی جائے، جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

مثلاً اگر ہم کسی باشعور انسان سے پوچھیں کہ بتاو، ایک ایسا معاشرہ ہونا چاہیے جس میں کھانے کو روٹی نہ ملے، رہنے کو گھر نہ ملے، تعلیم نہ ملے، علاج نہ ملے، یا ایسا معاشرہ ہونا چاہیے، جہاں یہ سب کچھ دستیاب ہوں۔ تو وہ فوراً بول اٹھے گا کہ جی ایسا معاشرہ ہونا چاہیے جہاں سب کو کھانا ملے، گھر ملے، تعلیم ملے، علاج ملے۔ تو اب ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی تمام کوششیں "عمل صالحہ" کہلائیں گی۔

مثلاً اگر ہم کسی باشعور انسان سے یہ پوچھیں کہ بتاؤ، یہ سڑک جس پر گاڑیاں چل رہی ہیں، لوگ سفر کر رہے ہیں، ان پر جابجا گڑھے پڑے ہوں، پتھر بکھرے ہوں، رکاوٹیں کھڑی ہوں، یہ ٹھیک ہے، یا سڑک ایسی ہونی چاہیے جو بلکل ہموار ہو، آسانی سے گاڑی چلائی جاسکے ایسی ہو۔ تو وہ فوراً پکار اٹھے گا کہ سڑک پر نہ تو گڑھے ہونے چاہیں، نہ رکاوٹیں۔ چنانچہ سڑک کو گڑھوں سے پاک کرنا، اس پر موجود تمام غیر ضروری رکاوٹوں کو دور کرنا، اس پر پڑے پتھروں کا ہٹانا "عمل صالحہ" کہلاتا ہے۔۔ جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی کامیابی و کامرانی ہے، اور اس دوسری دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۲۴:۵۵)

اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا کہ وہ سب صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے اور اس کے بعد بھی کوئی کافر ہو جائے تو درحقیقت وہی لوگ فاسق اور بدکردار ہیں (ترجمہ: سید ذیشان حیدر جوادی)

مزید فرمایا۔

وَمَن يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ (۲۰:۷۵) جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَن تَزَكَّىٰ (۲۰:۷٦)

اور جو اس کے پاس مومن ہو کر آئے گا حالانکہ اس نے اچھے کام بھی کیے ہوں تو ان کے لیے بلند مرتبے ہوں گے۔ ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ اس کی جزا ہے جو گناہ سے پاک ہوا (ترجمہ: احمد علی)

مزید فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۶:۹۷)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشر طیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے

(ترجمہ: ابو الاعلیٰ مودودی)

چنانچہ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر بہت سارے نقائص ہیں۔ گورے کے مقابلے میں کالا ہونا، طاقتور کے مقابلے میں کمزور ہونا، خوبصورت کے مقابلے میں، بد صورت ہونا، عقلمند کے مقابلے میں نالائق ہونا، کامیاب کے مقابلے میں ناکام ہونا، پیٹ بھرے کے مقابلے میں بھوکا ہونا، تعلیم یافتہ کے مقابلے میں جاہل ہونا، امیر کے مقابلے میں غریب ہونا، صحت مند کے مقابلے میں بیمار وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ خدا جو ہر شئے پر قادر ہے۔ جو مالک ہے۔ جو حاکم ہے۔ جسکی طاقت اور اختیار کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ کیا یہ تفاوت اس کے ادراک و اختیار سے دور کی بات ہے؟ کیا یہ سب کچھ اس کی اپنی تخلیق نہیں ہے؟ کیا وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ سب گورے ہی ہوتے، سب حسین ہوتے، سب عقلمند ہوتے۔ وہ یہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ خود نہیں کیا، بلکہ انسان کو اس کی صلاحیت عطا فرما دی کہ یہ تم کرو۔ اس سے تمہاری ذات کی وہ نشو و نما ہو گی ، جس کے نتیجہ میں تم اس دوسری دنیا میں داخلے کے اہل ہو جاؤ گے۔

اس نے انسان کو " عمل صالحہ "کا حکم دیا۔ کہا تم ایسی کوششیں کرو جس کے نتیجہ میں ہر شئے ویسی ہو جائے، جیسا کہ اسے ہونا چاہیے مثلاً اگر ہم کسی باشعور انسان نے یہ پوچھیں کہ بتاؤ، انسان کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کہ جاہل؟ انسان کو تندرست ہونا چاہیے کہ بیمار؟ انسان کو عقلمند ہونا چاہیے کہ نالائق؟ تو اس کا بے ساختہ یہ ہی جواب ہو گا، کہ انسان کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے، تندرست ہونا چاہیے، عقلمند ہونا چاہیے۔ اس ہی طرح جب اس سے پوچھا جائے کہ بتاؤ سب کو دولت مند ہونا چاہیے یا غریب؟ تو اس کا بھی یہ ہی جواب ہو گا کہ سب کے لیے فراوانی رزق ہونی چاہیے۔

چنانچہ کالے کو گورا کرنا، جاہل کو علم عطا کرنا، بیماری کا علاج دریافت کرنا، بد صورت کو حسین بنانا، غریب کو امیر بنانا یہ سب " عمل صالحہ " ہیں۔ لیکن کوئی ایسا عمل جس کے نتیجہ میں، سارے کالے ہو جائیں، سارے جاہل ہو جائیں، سارے بد صورت ہو جائیں، سارے نالائق ہو جائیں، سارے غریب ہو جائیں، یہ " عمل صالحہ " کی ضد ہے یعنی "فساد" کہلائے گا۔ اللہ کریم نے ہمیں عمل صالحہ کا حکم دیا ہے۔ اس نے ہمیں فساد سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۲٦:۱۵۰)وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ (۲٦:۱۵۱)الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲٦:۱۵۲)

پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا کہنا نہ مانو، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور (معاشرہ کی) اصلاح نہیں کرتے، (ترجمہ: طاہر القادری)

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۲٦:۱۸۳)

اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم (تول کے ساتھ) مت دیا کرو اور ملک میں (ایسی اخلاقی، مالی اور سماجی خیانتوں کے ذریعے) فساد انگیزی مت کرتے پھرو، (ترجمہ: طاہر القادری)

وہ اپنے فرمابردار بندوں کو حکم دیتا ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (۷:۵٦)

زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

وہ اپنے پیروکاروں کی فساد سے بچنے کے خوشگوار نتائج سے آگاہ فرماتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (۲۸:۸۳)

وہ آخرت کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے (ترجمہ: ابوالاعلی مودودی)

چنانچہ، اس زمین میں کوئی بھی شئے نہ تو اس مالک حقیقی سے پوشیدہ ہے، نہ اس کی اسکیم سے بالا ہے۔ جو کچھ بھی ہے اس کی حکمت بالغہ سے ہے۔ قانون وضابطوں کے مطابق ہے۔ بظاہر نظر آنے والے یہ سارے تضادات اور تفاوت اس کی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ ان تفاوات کو دور کرنے کا عمل "عمل صالحہ" ہے جس کے نتیجہ میں انسانی ذات کی نشو ونما ہو جاتی ہے۔ وہ دوسری دنیا میں آگے بڑھنے کی اہلیت حاصل کر لیتا ہے۔

چنانچہ ہمارا کام، گوروں کو کالا کرنا نہیں، بلکہ کالوں کو گورا کرنا ہے۔ ہمارا کام امیر کو غریب کرنا نہیں بلکہ غریب کو امیر بنانا ہے، ہمارا کام تندرست کو بیمار کرنا نہیں، بلکہ بیمار کو تندرست کرنا ہے، ہمارا کام حسین کو بدصورت بنانا نہیں، بلکہ بدصورت کو حسین بنانا ہے۔ اس ہی طرح ہمارا کام صاحب ثروت لوگوں سے ان کا مال متاع چھین کر انہیں غریب اور بے بس بنانا نہیں، بلکہ کمزور و نادار و غریب کو صاحب حیثیت بنانا ہے۔

ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں انسان کی کم از کم بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ ایسا نظام قائم کرنا ہے جہاں وسائل رزق اتنی فراوانی سے دستیاب ہوں کہ جو عزت کی روٹی اپنے زور بازو سے کمانا چاہے، اسے مل جائے۔ جہاں لوگ اپنی خون پسینے کی کمائی سے اپنا اور اپنے اہل خانہ کا رزق، زمین کا سینہ چیر کر حاصل کریں، نہ کہ کسی نام نہاد بیت المال کے سامنے لائن لگا کر۔ اس طرح رب کریم کے اس وعدے کی تکمیل ہو جائے، کہ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں، اور تمہارے بچوں کے رزق کے بھی۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں، میری جبین نیاز میں

سلامت رہیں